

## ہم ساحلوں کے پروردہ

اسی سے اوپر کی اسپید پر کار دوڑاتا ہوا وہ کارڈیو ویسکولر پیچ تھا۔ سی سی یو کے دروازے پر ہی اُسے ڈاکٹر احتشام اور ہارٹ سرجن بلگرامی مل گئے۔ وہ بے ساختہ ان کی طرف لپکا تھا۔

”کیا ہوا شامی ... گرینی اب کیسی ہیں؟“

وہ سخت تشویش زدہ اور متفکر نظر آ رہا تھا۔ احتشام اس کا شانہ تھپکتا اُسے اپنے ساتھ اپنے ریٹارنگ روم تک لے آیا۔

”پلیز شامی! مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے۔ از شی آل رائٹ۔“

”ریلیکس شاذان ... جسٹ ٹیک اٹ ایزی ... گرینی اب خطرے سے باہر ہیں، بس کمزوری ہے اُنہیں۔“

کرسی کی پشت پر ٹیک لگاتے ہوئے ڈاکٹر احتشام بہت سنجیدہ تھا۔

”تو کیا اٹیک آیا تھا؟“ وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں، مگر انجاناً ایک ضرور تھا ... ان فیکٹ گرینی سخت مینٹل اسٹریس کا شکار ہیں۔ اس پر تنہائی اور بڑھاپا۔ یوسٹ گو ہر کمپنی ... اُنہیں تمہاری ضرورت ہے شاذان۔“ احتشام نے صاف گوئی سے کہا تو وہ پشیمانی کے باعث چند سیکنڈ کے لیے لب بھینچ کر رہ گیا۔

”مگر میں نے اُن کے لیے نرس کا انتظام تو کر دیا تھا شامی۔ گھر پر بھی اُنہیں مکمل طبی سہولت مل رہی تھی، پھر میں ہر تیسرے مہینے آتا تو ہوں کراچی۔“

”ہاں، مگر یہ سب مسئلے کا حل نہیں ... تمہیں اندازہ ہونا چاہیے شاذان جو بیماری گرینی کو ہے اس میں تیسرے مہینے کی بات تو چھوڑو، ہم تین گھنٹے کے لیے کوئی پریڈکشن نہیں دے سکتے۔ تم نے سنا ہوگا کہ خالی دماغ میں اوٹ پٹانگ خیالات ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ بیماری اور بڑھاپے نے گرینی کو بہت زود رنج بنا دیا ہے۔ وہ خود ترسی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ اُنہیں فل ٹائم تمہاری ضرورت ہے۔ نرس یا ڈاکٹر تمہارا متبادل یا Substitute نہیں ہو سکتے ... خصوصاً اس صورت میں کہ ان کا تمہارے علاوہ کوئی اور ہے بھی نہیں۔“ احتشام نے اُسے جیسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

وہ پیشانی کو اُنگلی سے مسلتے ہوئے بولا۔ ”بٹ یو نو مائی پرا بلیم شامی ... کرسٹینا کسی صورت میں پاکستان آنے کو تیار نہیں ... ادھر گرینی ہیں کہ وہ پاکستان چھوڑنا نہیں چاہتیں ... اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کبھی کرسٹینا تو کبھی گرینی کے کورٹ میں چکراتے چکراتے میں خود تھک گیا ہوں۔“

میز پر مکا مارتے ہوئے وہ سخت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔ پریشانی اور الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا

”تو پھر اس کا آسان حل تو یہی ہے کہ کرسٹینا کو چھوڑ کر گرینی کے پاس آ جاؤ۔“ وہ بے دردی سے کہتا میز پر کہنیاں ٹکا کر اس کی طرف جھک آیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ شاذان کی آنکھوں میں شکایت اور غصہ اُتر آیا۔

”شی از مائی وائف شامی اینڈ آئی لو ہر ویری مچ۔“ تند لہجہ اس کی ناگواری کا غماز تھا۔

”تو ٹھیک ہے پھر گرینی کی فکر چھوڑ دو۔ یہ بیماری اُنہیں زیادہ دن جینے نہیں دے گی۔ اس کے بعد تم با آسانی اپنی زندگی بغیر کسی گلی کے گزار سکو گے ... جب تک گرینی کی سانس چل رہی ہیں، اُسی طرح پاکستان آتے رہو اور اُنہیں ہاسپٹلائز کرا کے اپنے ضمیر پر پڑا ہوا بوجھ چند دن کی رفاقت عطا کر کے اُتارتے رہو۔ Soon you will get rid of it. یکنم احتشام کو لہجہ تلخی اور ناگواری سے تند ہو گیا تھا۔ شاذان کے ماتھے کے بل صاف گنے جانے لگے۔

”شامی دس از موسٹ اُن فیئر ... میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔“

”تو کیا ہے تمہارا مطلب ... تم چاہتے ہو کہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے رہو پھر بھی میں تمہیں پچکارتا رہوں ... تمہارا شانہ تھپتھپاتا رہوں کہ واہ میرے یار کیا خوب کمال کیا۔ بیمار دادی کا ہاسپٹل میں علاج کرا دیا، ویری گڈ اپنی وائف کی خدمت میں حاضری لگا دی، ویری ویل ...“

احتشام بری طرح جھلا گیا تھا۔ شاذان نے بمشکل غصہ ضبط کر کے اُسے دیکھا تھا۔

”نہیں شاذان نہیں ... یہ مسئلے کا حل نہیں ... تمہیں یا تو واقعی گرینی کا ٹھیک سے خیال رکھنا ہوگا یا پھر اپنے ذہن سے اُن کی فکر بالکل نکال دو کیونکہ تم بیک وقت دو جگہ موجود نہیں رہ سکتے ... نہ ہی اُن دونوں کو کسی ایک جگہ پر یکجا کر سکتے ہیں۔ کسی ایک کو چُن لو ... یا تو کرسٹینا یا پھر گرینی ... دیٹس آل۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں کہتا اُٹھ کھڑا ہوا تو شاذان کے لب آپ ہی آپ بھیج گئے۔ پریشانی اور ٹینشن اس کے چہرے کے خدوخال کا حصہ بن گئے تھے۔ احتشام کو اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ سنجیدگی سے اس کے نزدیک آ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”دیکھو شاذان! میں تمہارا دوست ہوں ... بچپن سے آج تک گرینی کو تمہاری طرح چاہا ہے میں نے، مگر حقیقت یہی ہے کہ تم اُن کے ریل گرینڈ سن ہو ... تمہیں ہی اُن کا خیال رکھنا ہے۔ میں چاہوں بھی تو گرینی میرے ساتھ میرے گھر پر رہنے پر تیار نہ ہوں گی ... نہ ہی میری بیوی تمہارے گھر شفٹ ہونے پر میری حمایت کرے گی تو یہ تو طے ہو گیا کہ گرینی کی تنہائی تمہیں ہی دور کرنی ہے ... میری بات اگر اُس وقت مان لی ہوتی تو آج کرسٹینا کی

بجائے کوئی مسلم لڑکی تمہاری وائف ہوتی جو گرینی کا بھی خیال رکھتی اور ”حیات ولا“ کو وارث بھی دیتی ... پھر تمہیں اس طرح پریشان نہ ہونا پڑتا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہوتی ہے اس طرح دونوں طرف منقسم ہو کر تم کہیں بیمار ہی نہ پڑ جاؤ۔“ وہ دلداری اور تاسف سے کہہ رہا تھا۔

شاذان اس کی ہمدردی پر پھیکے پن سے مسکرا دیا۔ ”تمہارا کہنا بالکل ٹھیک ہے شامی، مگر میں کرسٹینا سے محبت کرتا ہوں ... بہت سی شرائط منوا کر اس نے مجھ سے شادی کی حامی بھری تھی۔“

”اسی کی سزا آج تک تم بھگت رہے ہو۔“ شامی نے بیچ میں ٹوک دیا تھا، مگر وہ ان سنی کر کے کہتا گیا۔

”دوسری طرف گرینی ہیں جنہوں نے مجھے ماما کے بعد ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی حتیٰ کہ ڈیڈی کی ڈیٹھ اور میرے لندن چلے جانے نے انہیں بالکل توڑ دیا ... تب بھی وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوئیں ... میں دونوں میں سے کسی کو چھوڑ نہیں سکتا۔“ بے بسی اور بے چارگی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ بالوں میں بے چینی سے انگلیاں پھنساتے ہوئے وہ بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

”تو پھر کرسٹینا کو سمجھاؤ، کنولس کرو اُسے ... گرینی کی حالت ایسی نہیں کہ وہ سفر کر سکیں ... نہ ہی اس کنڈیشن میں اُن کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے ... کرسٹینا سے کہو چند سال کے لیے پاکستان آجائے ... ممکن ہے اس دوران گرینی کور کر جائیں بلکہ اگر کرسٹینا نے ان کا دل جیت لیا تو یہ اُمید بھی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ لندن جانے کے لیے راضی بھی ہو جائیں، پھر تمہارے لیے منیج کرنا آسان ہوگا، مگر اس سب کے لیے تمہاری وائف کرسٹینا کا تم سے ایگری کرنا ضروری ہے۔ جسٹ کنولس ہر۔“ ڈاکٹر احتشام نے کرسٹینا سے متعلق اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے دوستانہ انداز میں اُسے سمجھایا تھا۔

وہ کچھ ریلیکس تو ضرور ہوا تاہم اس کے چہرے سے مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔ کیونکہ کرسٹینا نے اس سے شادی کی ہی اسی شرط پر تھی کہ وہ کبھی اسے اپنا ملک چھوڑنے کو نہیں کہے گا۔ ایک گہری سانس بھر پر اس نے یہ بات احتشام سے کہہ بھی دی۔

”تمہارا مشورہ اپنی جگہ درست ہے، مگر شامی میں نے کرسٹینا کی اس شرط کو اول روز ہی مان لیا تھا جب اس نے مجھ سے شادی کی تھی کہ کبھی اسے پاکستان آنے کے لیے نہیں کہوں گا۔“ اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

احتشام کے چہرے سے تناؤ جھلکنے لگا۔ ”کیسے زن مرید ہو تم شاذان ... ایک عورت کے آگے بے بس ہو گئے ہو ... کیا یہی تمہاری مردانگی ہے ... کیا اسی کو ...“

”مردانگی اپنا وعدہ پورا کرنے میں ہی ہے شامی ...“ وہ اس کی بات تیزی سے کاٹ گیا تھا۔

”اور فرائض، کیا فرائض ادا کرنے کے لیے تم دوسرا جنم لینے والے ہو؟“ احتشام کے پیروں سے لگی سر پر بھی تھی۔ شاذان اس درجہ صاف گوئی پر مشتعل سا ہو گیا تھا۔ غصیلی نظریں اس پر ڈالتے ہوئے بولا

”اسٹاپ اٹ احتشام ... اب بس کرو ... اس وقت میں مزید کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ... فی الحال صرف اتنا کہو کہ گرینی کب تک یہاں رہیں گی؟“ اس کے ضبط کا خول چٹ گیا تھا۔

احتشام نے چند سیکنڈ اُسے شاکی نظروں سے دیکھا اور پھر گھوم کر اپنی راکنگ چیئر پر جا بیٹھا۔ ایک فائل اٹھائی اور اس کے سامنے بیٹھ دی۔

”یہ آپ کی پیشنت کی رپورٹس ہیں، انہیں دیکھ لیں ... ڈسپارچ کے متعلق آپ ڈاکٹر بالگرامی سے بات کر سکتے ہیں ... وہی ڈیساؤ کریں گے ...“

سخت برگشتہ انداز میں کہہ کر احتشام انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گیا تو شاذان ایک لمحے کو شرمندہ تو ہوا، مگر اپنی انا کی بات بھی رکھنی تھی سو پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔

”اسٹوپڈ ... ایک لڑکی کے آگے مکڑی بن کر ناچ رہا ہے ... احمق کو اتنا اندازہ نہیں ہے کرسٹینا جیسی تو کئی لڑکیاں مل سکتی ہیں، مگر خلوص اور محبت سے گندھا گرینی جیسا وجود ایک بار کھو دیا تو تا عمر پچھتانا پڑے گا۔“

اسے جاتا دیکھ کر وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور سرجن بلگرامی کے روم میں فون ملا کر بولا۔ ”جی شاذان آپ کی طرف آیا ہوگا اُسے کولڈ ڈرنک پلائیں، ذرا دماغ ٹھنڈا کریں اس کا ... میں آتا ہوں ذرا دیر میں۔“

☆.....☆.....☆

”اُف خدایا! تمہیں تو سخت ٹمپریچر ہے ایما۔“ عینی نے مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھاما تو جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ بھاری آواز اور سرخ چہرے سمیت وہ ایک نظر میں ہی سخت بیمار نظر آ رہی تھی، مگر بضد تھی جھٹلانے پر۔

”دماغ تو درست ہے تمہارا ... خاک ٹھیک ہو ... پورا جسم تپ رہا ہے تمہارا اور چلی ہو آفس۔“ عینی نے بری طرح لتاڑا تھا اُسے۔

وہ سر جھکا کر چادر بستر سے اٹھانے لگی تھی جیسے عینی نے جھپٹ لیا تھا۔ ”خبردار جو گھر سے ایک قدم بھی باہر نکالا تو سر توڑ دوں گی تمہارا ... کچھ خدا کا خوف بھی کرو۔ اس حالت میں آفس جاؤ گی تو کام کیا خاک کرو گی اور اگر طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو گھر تک آنا بھی مشکل ہو جائے گا۔“ عینی نے آنکھیں نکالی تھیں اس پر۔

مگر ادھر مطلق اثر نہ تھا۔ نرمی سے چادر اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ”پلیز عینی، تم تردد مت کرو ... آج آفس جانا بے حد ضروری ہے ... آج سیلری ڈے ہے، تمہیں معلوم ہے کہ پچھو ایک ہفتے سے پیسوں کا تقاضا کر رہی ہیں ... میں آج نہیں جاؤں گی تو ...“

”تو قیامت نہیں آجائے گی ... تمہاری بے حس اور جلاد پھپھو پر تو میں دو مرتبہ لعنت بھیجتی ہوں ... بلکہ تم ...“

”اُف یہ کیا کہہ رہی ہو عینی۔“ وہ تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر عاجزی سے بولی  
 ”پھپھو سامنے والے کمرے میں موجود ہیں ... سُن لیں گی تو ہڈیاں توڑ ڈالیں گی میری۔“ خوف و دہشت سے وہ لرز  
 سی گئی تھی۔

عینی کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر اُسے زبردستی بستر پر بٹھایا۔ ”سنتی ہیں تو سُن لیں۔ میری  
 طرف سے دو روٹی زیادہ کھائیں ... رہ گئی ہڈیاں توڑنے کی بات تو پہلے ہی کچھ کم تشدد کیا ہے اُنہوں نے تم پر ... سچ  
 ایما تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو عورتوں کے تھانے میں جا کر ایف آئی آر کٹواتی ان بیگم جلاد کی ... ساری طراری ہوا  
 ہو جاتی۔“ اب کے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر بمشکل عینی نے اپنا ولیم کم کیا تھا۔  
 ”ایسی باتیں مت کرو عینی ... ایک پھپھو ہی تو میرا واحد سہارا ہیں۔“

”فضول مت بکو ... سہارا صرف اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے، جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہے۔ تم خود کو پھپھو کی  
 چلچلاتی دھوپ ایسے سائے میں محفوظ سمجھ کر غلطی کر رہی ہو ... تمہاری پھپھو کو تم سے نہیں، تمہاری تنخواہ اور تمہارے بابا  
 کے چھوڑے ہوئے اس مکان سے محبت ہے۔ اسی لیے وہ تمہاری اس موٹے بھوت سے شادی کرنا چاہتی ہیں، تاکہ تم  
 جاؤ تو مکان اُن کے نام ہو جائے۔ ساتھ ہی اچھی رقم بھی ہاتھ لگے جو وہ بھوت تمہاری قیمت کے طور پر دینے کو تیار  
 ہے۔“

عینی جلے دن سے بولتی چلی گئی تھی۔ ایما پلکیں جھپک کر آنسوؤں پر بند باندھنے کی کوشش میں نڈھال سی  
 ہو گئی۔ بعض حقائق تو اس قدر تلخ ہوتے ہیں کہ انسان جب جب ان کا سامنا کرتا ہے، اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے  
 ... یہی سنگین حقیقتیں تھیں جنہیں وہ قصداً نظر انداز کیے ہوئے تھی، مگر عینی کبھی کبھی اس بے دردی سے اُسے کانٹوں میں  
 گھسیٹتی کہ اس کا پورا وجود لہو لہان ہو جاتا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، پھپھو کی کاٹ دار آواز سنائی دی۔  
 ”ایما ... ابھی تک یہیں کھڑی ہو ... آفس نہیں جانا کیا؟“ آواز تھی کہ کوڑا ... وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتی  
 بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کوئی ضرورت نہیں تمہیں جانے کی ... لیٹ جاؤ ... سچ ایما تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔“ عینی نے  
 انتہائی نفرت اور غصے سے سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا اور اس سے ملائمت اور ہمدردی سے بولی  
 ”پلیز عینی تم فکر مت کرو، میں ٹھیک ہوں۔ آج سیلری مل جائے گی تو راستے میں ڈاکٹر کو بھی دکھاتی آؤں  
 گی ... فی الحال تم چلنے کی کرو ... دیکھو تو کتنی دیر ہو گئی ہے، کہیں بس ہی نہ نکل جائے۔“

اس نے کچھ اس عاجزی اور لجاجت سے کہا کہ عینی بادلِ خواستہ تیار تو ہو گئی، مگر راستے بھر اس کی بڑبڑاہٹ  
 رُکی نہیں۔ پھپھو کو تقریباً ہر طرح کے لقب سے پکارنے کے باوجود اُسے سکون نہیں آیا تھا۔

ایما کا بخار اب حد سے تجاوز کرتا جا رہا تھا۔ سو وہ سرخ چہرہ لیے خاموش بیٹھی رہی حتیٰ کہ آفس آگیا ”شاذان کنسٹرکشن کمپنی“ کی سہ منزلہ عمارت اپنے اسی طمطراق سے سامنے کھڑی تھی۔

وہ دونوں اُتریں تو ایک لمحے کو ایما کر سر بری طرح چکرا گیا۔ بمشکل ساتھ چلتی عینی کا کندھا تھاما۔  
”دیکھا! کہا تھا نا میں نے کہ مت چلو آفس، مگر تم اپنی پھپھو سے کم ضدی نہیں ہو۔“ عینی کا غصہ ایک بار پھر ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔ اُسے ساتھ لیے دس باتیں سناتی وہ اندر آئی تو آفس میں کھلبلی سی مچی محسوس ہوئی۔  
”خیریت تو ہے ... آج کیا خاص بات ہے؟“ عینی کو فکر لگ گئی تھی۔ آگے بڑھ کر صدف سے پوچھا۔  
”آج شاذان صاحب آ رہے ہیں ... وہ بھی پورے چھ ماہ بعد ... صبح ہی صبح یہ اطلاع ملی ہے، اس لیے سب بوکھلا رہے ہیں۔ کوئی شے ٹھکانے پر نہیں ہے۔“ صدف سے مفصل اطلاع ملی۔

”اوہ!“ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ایما کے تو جیسے تلوؤں تلے زمین ہی نکل گئی تھی۔  
”مگر شاذان صاحب نے اچانک یہاں آنے کا پروگرام کیسے بنالیا؟ کچھلی بار وہ کراچی آئے تھے جب تو اس طرف آنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی اُنہوں نے۔“ عینی نے اسے ایک طرف بٹھا کر سوال جواب شروع کر دیے تھے۔

”ہاں بس کچھلی بار تو وہ صرف تین چار دن کے لیے آئے تھے نا، مگر اس مرتبہ تو سنا ہے کہ ان کی دادی سخت بیمار ہیں ... اسپتال میں داخل کرا رکھا ہے اس لیے ابھی کچھ دن یہاں رُکیں گے۔ شاید بوریت سے بچنے کے لیے یہاں آ رہے ہوں“ صدف نے کندھے اچکاتے ہوئے بتایا۔

”مگر اُن کی اس ”تفریح“ میں ہمارے ساتھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔ دیکھنا آج تو سیلری بھی نہیں ملنے والی ... جی ایم صاحب کے تو چہرے پر ہی ہوائیاں اُڑتی نظر آ رہی ہیں۔“

اپنے کیبن سے ایم ڈی کے کیبن کی طرف بوکھلائے ہوئے انداز میں جاتے ہوئے قریشی صاحب کو دیکھ کر عینی نے مایوسی سے کہا تو ایما کی بقیہ جان بھی نکل گئی۔

”کیا بہت غصیلے اور تند مزاج کے آدمی ہیں ... ایم ڈی؟“ گھبراہٹ میں اُٹھ کر وہ بھی صدف اور عینی کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

”لو تمہیں نہیں معلوم؟“ صدف نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

”نہیں یار! اسے ابھی صرف چار ماہ ہی تو ہوئے ہیں یہاں جاب کرتے ہوئے۔ شاذان صاحب سے آج پہلی مرتبہ ملاقات ہوگی۔“ عینی نے اطلاعاً بتایا تو صدف نے اُسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔

”ذرا ہوشیار رہنا ... خاصے خر دماغ آدمی ہیں۔ اسی وجہ سے آج تک اُن کی سیکریٹری کی سیٹ پر جو بھی لڑکی آئی، ایک ماہ میں ہی ریزائن کر گئی یا پھر اُنہوں نے خود اُسے ٹرمینٹ کر دیا۔ تمہاری تو لک اچھی ہے کہ چار ماہ سے

اس پوسٹ پر لکھی ہوئی ہو۔“ صدف کا تبصرہ اُسے سہا گیا۔

”مگر قریشی صاحب تو بہت اچھے ہیں، وہ تو کبھی نہیں ڈانٹتے۔“

”قریشی صاحب کی بات اور ہے ... وہ شاذان صاحب کے جڑواں بھائی نہیں کہ اُن کی جیسی عادات کے حامل ہوں، مگر دیکھو ایما تم ذرا خیال سے رہنا۔ جانتی ہونا کتنی مشکلوں اور سفارشوں کے بعد تمہیں یہ جاب ملی ہے۔ اُسے گوانا تمہارے لیے سخت نقصان دہ ہوگا ... خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ تمہاری پھپھو تمہیں بنا پیسے کے ایک منٹ برداشت کرنے کی روادار نہیں۔“ صدف کی دیکھا دیکھی عینی بھی اُسے سراسیمہ کیے دے رہی تھی۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”کچھ ایسا خاص تردد کرنے کی ضرورت نہیں ... بس ذرا ایکٹو رہنا ... یوں بھی تم جیسی دبوٹکی کو سیکریٹری کی فل ٹائم ایفی شینسی کی متقاضی سیٹ پر دیکھ کر تو یوں بھی انہیں غصہ آسکتا ہے۔“ صدف نے پھر کڑا تبصرہ کیا۔

بخار نے کچھ کم نقاہت پیدا کی تھی اس پر مستزاد یہ صورت حال ... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اب یہاں کیا کر رہی ہو، چلو جلدی سے اپنے روم میں جاؤ۔“ عینی نے اُسے ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ چوکی۔

”اوہ میرے خدایا! صدف اُسے تو بہت تیز بخار تھا۔ سچ یہاں آکر تو میں بالکل ہی بھول گئی ... ایسا کرو کہ

پہلے ایما کے لیے دوا کا انتظام کرو جب تک میں اسے اس کے روم میں چھوڑ کر آتی ہوں۔“

صدف کو سک روم کی طرف دوڑانے کے بعد وہ اُسے لے کر ایم ڈی کے کیمبن کے ساتھ ملحقہ کمرے میں

آئی۔ ایما کی حالت دیدنی تھی۔ اُسے اپنی جاب ختم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

”عینی! اب میں کیا کروں؟ سچ مجھے تو بہت خوف آ رہا ہے۔“ چادر ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے دوپٹہ

سلیقے سے شانوں پر پھیلایا تھا۔ مگر چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عینی کو یک بیک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُسے

کچھ زیادہ ہی ڈرا دیا تھا اُنہوں نے۔ بخار کی سرخی اب خوف کی سفیدی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

”کم آن ایما ... اب ایسی بھی خونخوار مخلوق نہیں ہیں وہ ... بس ذرا انگلینڈ سے آئے ہیں نا تو زیادہ ہی بھرم

دیتے ہیں، مگر تمہیں اُن کے رعب میں آنے کی ضرورت نہیں ... ایسے لوگ بولڈ لڑکیوں سے متاثر ہوتے ہیں ... تم

بھی ذرا بہادری اور اعتماد سے کام کرنا۔“ اس کا ہاتھ ہمدردی سے تھامتے ہوئے اب وہ اُسے تسلی دے رہی تھی۔ گر بتا

رہی تھی۔

”مگر میں یہ سب نہیں کر سکتی عینی ... تم اچھی طرح جانتی ہو ... میرا تو ابھی انٹر کا رزلٹ بھی نہیں آیا۔ یہاں

تو تمہارے بابا کی سفارش سے یہ جاب مل گئی تھی اگر یہاں سے نکال دیا گیا تو پھپھو تو ...“ کچھ بیماری اور کچھ فطری

بزدلی نے اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ بے بسی سے کہتے کہتے وہ جیسے رو پڑی تھی۔ عینی کو تو لینے کے دینے پڑ

گئے۔

”پلیز ایما تم خود کو سنبھالو ... ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم ایک اچھی ورکر ہو، گزشتہ چار پانچ ماہ سے جی ایم صاحب کے ساتھ کام کر رہی ہو ... میں یقین سے کہہ رہی ہوں کہ وہ تمہارا خیال ضرور کریں گے اور ...“

”یعنی چلو جلدی اپنی سیٹ پر، قریشی صاحب خفا ہو رہے ہیں۔“

صدف دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو عینی اُسے ”سب ٹھیک ہو جائے گا“ کی تسلی دیتی بخار کے لیے ٹیبلٹ اور پانی پکڑا کر باہر چل دی کہ بہر حال نوکری تو اُسے بھی عزیز تھی۔ وہ تو یہ تھا کہ عینی کے والد کی بہت اچھی کارکردگی اور ایمانداری کے باعث قریشی صاحب نے اُن کی بیٹی عینی اور پڑوسی ایما کو جاب دے دی تھی ورنہ در حقیقت دونوں لڑکیوں کی تعلیم دی گئی پوسٹ کی مطلوبہ کوالیفیکیشن سے کم تھی۔

عینی کو ابھی تھرڈ ایئر کا امتحان دینا تھا جبکہ ایما کا ابھی تک انٹر کا رزلٹ بھی آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ عینی چلی گئی تو وہ میز سے سرٹکا کر بیٹھ گئی۔

پھپھو اور شاذان حیات علی دونوں کا خیال اُسے کسی عفریت کی طرح شکنجے میں لیے ہوئے تھا، مگر زیادہ دیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھ سکی۔ کل کا کچھ بقیہ کام تھا جسے پورا کرنے کی ہمت کرتے ہوئے اس نے آغاز کر ہی دیا۔ ذرا دیر بعد ہی انٹر کام پر قریشی صاحب نے اُسے ایم ڈی کے آفس میں بلایا تو وہ لرزتے ہاتھوں سے ریسپور رکھ کر سر تھامتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”اب کیا کروں ... میرا تو سر چکرا رہا ہے ... اس پر خوف کی وجہ سے میں تو بول بھی نہیں پاؤں گی۔ قریشی صاحب نے بھی تو پہلے سے کچھ سمجھایا نہیں۔“ وہ سخت گھبرا رہی تھی۔

مگر جانا تو تھا۔ پچھلے چار ماہ میں اس نے یہاں کا سب کام سیکھ لیا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور اُسے اس نوکری کی اشد ضرورت تھی، لہذا اس نے اپنی تمام تر صلاحیت بروئے کار لا کر قریشی صاحب کو مطمئن کر دیا تھا لیکن اب اس نئی صورت حال سے وہ سٹیٹا رہی تھی۔

کیبن میں داخل ہوتے ہوئے وہ اپنا بخار بھول چکی تھی۔ محض ”اب کیا ہوگا؟“ کی فکر سر پر سوار تھی۔ کمرے کا رخ ماحول اس کے حواس اور بھی منجمد کیے دے رہا تھا۔

”گڈ مارننگ سر ...“

اندر داخل ہوتے ہی اس نے لرزیدہ آواز اور میکاکی انداز میں کہا تھا۔ شاذان سمیت قریشی صاحب بھی چونکے۔

”جی سر! یہ ہیں آپ کی نئی پی اے مس ایما شاہنواز ... پچھلے چار ماہ سے یہاں جاب کر رہی ہیں اینڈ شی از آگڈ ورکر ...“

قریشی صاحب کی تعریف پر اُسے کچھ سکون ملا تھا، مگر جونہی نظر اٹھا کر سامنے بیٹھے ایم ڈی کو دیکھا، سارا



اطمینان رخصت ہو گیا۔ شاذان بے حد سنجیدگی سے اُسے دیکھا رہا تھا۔

”یو مے سٹ ڈاؤن مس ... ایما ...“

اس کے گھبرائے ہوئے انداز پر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”کیا کوالیفیکیشن ہے آپ کی؟“

بیٹھتے ہی سوال ہوا تھا۔ اس کی کچھ تفکر سے قریشی صاحب کی طرف دیکھا، جنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے تسلی دی تھی، مگر اس کی یہ حرکت شاذان کی عقابانی نظروں سے بچ نہ سکی تھی (ایک اور انٹرویو ... یا خدایا مجھے کامیاب کرنا)

”جی ... ایف ایس سی!“

”واٹ ...“ جانے وہ حیران ہوا تھا یا غصہ ... وہ اپنی جگہ کانپ سی گئی ... آنکھوں میں نمی جمع ہونی شروع ہو گئی تھی۔

”سر یہ بہت ہارڈ ورکنگ لڑکی ہے۔ میں نے ان کے بیک گراؤنڈ کی وجہ سے انہیں جاب دی ہے۔ تعلیم کم ضرور ہے، مگر یہ بہت انٹیلی جینٹ ہے اور آگے بھی تعلیم جاری رکھے گی۔“

قریشی صاحب نے شاذان کے تیور دیکھے تو بے جلت بولے۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ شاذان بہت تند اور تنکھے تیوروں سمیت قریشی صاحب کو سُن رہا تھا۔

”بٹ قریشی صاحب، دس از مائی آفس ... یہ کوئی فلاحی ادارہ یا این جی او نہیں ہے۔ You must follow the rules“ اُن کے خاموش ہونے پر وہ سخت لہجے میں بولا اور پھر اس کی طرف مڑا

”لسن مس ایما ... ہمارے یہاں اس پوسٹ کے لیے کم از کم گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ آپ کی اتنی تعریف پر یہی ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کو کہیں اور ایڈجسٹ کر دیں۔ سو میک اپن پور مائنڈ ... میں کل یا پرسوں تک آپ کو بتا دوں گا مگر جب ...“

”پلیز سر! آپ میرا کام دیکھیں۔ آئی ایم شیور آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔“

ساری ہمتیں مجتمع کر کے وہ محض اتنا ہی کہہ سکی۔ وہ بھی قریشی صاحب کے اشارے پر ورنہ تو وہ خاموشی سے اُٹھ آنے میں ہی عافیت محسوس کر رہی تھی۔

شاذان نے اپنی بات مکمل نہ ہونے پر قدرے ناراضگی سے اُسے دیکھا تھا۔ تاہم اُسے کچھ حیرانی ہوئی تھی۔ غالباً اس کے بولنے کی اُمید نہیں تھی۔ اب کے بغور اُسے دیکھا۔

سیدھی مانگ والے سادہ سے بال بنائے۔ سفید شلوار سوٹ پر گلابی کڑھائی والے دوپٹے کو سلیقے سے شانوں پر جمائے اس کی شخصیت خاصی اُجلی لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں متضاد تاثرات رقم تھے۔ تو چہرے پر نقاہت کے واضح

شواہد موجود نظر آرہے تھے۔ انٹر کے حساب سے عمر بھی اٹھارہ اُنیس سال کے لگ بھگ تھی۔  
 ”ہوں ...“ وہ کچھ سوچ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا۔ ”آپ کو کیا لگتا ہے؟ کیا آپ خود کو منوا سکیں گی؟“

گہری سنجیدہ نظریں براہِ راست اُسے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ نروس سی ہو گئی  
 ”آئی ول ٹرائی مائی لیول بیسٹ سر ...“ مرتعش سا غنائیہ لہجہ تھا۔ شاذان نے گہری سانس لی، پھر سیدھا ہو بیٹھا۔ جانے اُسے کس چیز نے متاثر کیا تھا۔ سر ہلا کر بولا۔

”اوکے اگلے ایک ہفتے تک میں آپ کو ٹرائل پر رکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد کا فیصلہ آپ کے کام پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ناؤ یو مے گو۔ ضرورت پڑی تو میں کال کر لوں گا۔“

”جی سر ...“ اُسے لگا جیسے سات دنوں کی مہلت نہیں اُسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ خوشی کے بے پایاں احساس کو چھپاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، تاہم اس کی ہلکی سرمی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔  
 شاذان نے اُسے دیکھا وہ تشکر تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی، لہذا جاتے جاتے اس نے بہت ممنونیت سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔ قریشی صاحب بردباری سے مسکرا دیے جبکہ شاذان کچھ عجیب سا محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔  
 یہ انداز یہ آنکھیں اس کی کہیں دیکھیں تھیں۔

مگر کہاں؟ اس وقت یاد نہیں آ سکا۔

”تھینک یو سر! آپ نے ایک ضرورت مند لڑکی کا خیال کر لیا۔ ان فیکٹ یہ بچی ہمارے بہت پرانے ورکر کی بیٹی ہے۔ ایک حادثے میں وہ بے چارہ پیرالائز ہو گیا تو اُسے جاب چھوڑنی پڑی، تاہم آپ کے والد صاحب نے جہاں تک ہوسکا علاج معالجے کے لیے مالی مدد کی تھی۔ اس وقت یہ بچی بہت چھوٹی تھی۔ انٹر کے بعد بڑی اُمید سے یہاں آئی تو میں نے یہ سوچ کر جاب دے دی کہ یہاں کا ماحول اچھا ہے۔ نجانے اُسے کہیں اور کیسا ماحول میسر آئے؟ ایسے معصوم وجود مٹی میں رل جائیں تو معاشرے کا اجتماعی نقصان ہے۔“ قریشی صاحب بڑی شفقت سے اس کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے تھے۔

شاذان اپنی ذہنی الجھن کے باوجود اُنہیں سن رہا تھا۔ کچھ متاثر ہوا، مگر پھر اُنہیں دوسری طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔

”اٹس اوکے قریشی صاحب! فی الحال تو آپ مجھے پچھلے ماہ کی مکمل رپورٹ پیش کریں۔“

”وہ تو جی میں نے آپ کو لندن بھجوائی ہے ... ہر ماہ باقاعدگی سے۔“

”ہوں ... مگر میں فی الحال اکاؤنٹس کی بات کر رہا ہوں۔ آئی وانٹ ٹو چیک آل دا اکاؤنٹس رائٹ ناؤ۔“  
 اُنکی اٹھا کر اس نے حکمیہ کہا تو قریشی صاحب سر ہلاتے باہر چل دیے۔

پھر پورا دن اسی کام کی نذر ہو گیا۔ شاذان کی چیکنگ کے سلسلے میں بہت سی نا اہلیاں ثابت ہوئی، چنانچہ اس کا سخت نوٹس لیا گیا۔ ایما کے لیے یہ منظر بہت دہشت انگیز تھا۔ کچھ دیر پہلے جو اُمید اس کے اندر پھول کھلا گئی تھی، کسی چراغ کی مانند بجھ سی گئی۔ تاہم سیلری مل جانے کے باعث ٹینشن نسبتاً کم ہو گئی تھی۔

”خیریت اب کیا پریشانی ہے، تم اتنی ٹینس کیوں ہو رہی ہو؟“

واپسی پر عینی نے اس کا موڈ نوٹ کر لیا تھا۔ بخار تو قدرے کم تھا۔ سیلری بھی مل گئی تھی، لہذا اسے اس کے اس طرح منہ لٹکانے پر حیرت ہو رہی تھی۔ جواباً اس نے ساری کتھا کہہ سنائی۔

”پتہ نہیں عینی! مجھے کوئی خاص اُمید نہیں۔ یہ ایم ڈی تو بہت ہی سخت مزاج ہیں ... ذرا ذرا سی بات پر آج لوگوں کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔“ وہ خاصی مایوس ہو رہی تھی۔

”ڈپٹ ہی رہے تھے نا، جاب سے نکالا تو نہیں ... تمہیں بھی زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ... یوں کرنا کہ ان سات دنوں میں کوئی وظیفہ پڑھ کر دعا مانگ لینا بلکہ وظیفے سے یاد آیا کہ کوئی وظیفہ ایسا پڑھ لو جس میں تمہاری پھپھو فوت ہو جائیں۔ عینی اطمینان سے کہتے ہوئے پھر پڑی بدل گئی تھی۔ پھپھو سے تو اُسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔

”ایسے مت کہو عینی ... بابا کے بعد پھپھو ہی تو میرا واحد سہارا ہیں۔ وہ اگر گاؤں سے آکر مجھے سہارا نہ دیتیں، تو اتنے بڑے شہر میں کہاں جاتی؟“

”بس تمہاری ان ہی باتوں نے اُنہیں خود کو خدا سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے، مگر قصور تمہارا نہیں، تمہاری عمر کا ہے۔ اس عمر میں ہر پیڑ کی چھاؤں اپنی لگتی ہے۔ وہ تو بعد میں سمجھ میں آتا ہے کہ جب تجربے کے پتھر پڑ جاتے ہیں۔“ عینی نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی میں ہی عافیت جان کر چپ ہو رہی۔

پھپھو کے رویے سے متعلق عینی کی رائے سے وہ بھی متفق تھی مگر اُسے پھپھو کے احسان بھی یاد تھے کہ بابا کی علالت کے دوران پڑھائی اور کم عمری کے باعث وہ اُن کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی تھی جیسے پھپھو نے کی۔ اب اس ”خدمت“ کے پیچھے جو بھی ”نظریہ“ کار بند رہا، اس سے قطع نظر وہ پھپھو کی ممنون تھی، بلکہ اب بھی ان کے تمام تر تشدد اور لالچ کے باوجود وہ اُنہیں چاہتی تھی۔

پیسہ کس کی ضرورت نہیں؟ پھپھو بھی مجبور تھیں، گھر کے خرچ اور دیگر ضروریات کے لیے اُنہیں پیسوں کی ضرورت رہتی تھی اور اس کے لیے صرف ایما ہی وہ ہستی رہ گئی تھی گھر میں جو کما سکتی تھی۔ پھپھو تو خود گاؤں کے ماحول کی پروردہ تھیں۔ تاہم شہر آکر ان کے طور طریقے اور سوچ میں بڑا فرق آ گیا تھا۔

محض دو افراد کا خرچہ کتنا ہو سکتا ہے، مگر پھپھو کو زیادہ کی ہوس رہتی تھی اور اس نے کبھی پلٹ کر پوچھا نہیں کہ جب گھر میں زیادہ تر دال روٹی ہی بنتی ہے تو اتنی تنخواہ کہاں جاتی ہے؟ ایک آدھ ٹیوشن بھی وہ پڑھاتی تھی، اس کی بھی فیسیں ملتی تھی، مگر وہ سب پھپھو اس سے اس کا جہیز بنانے کے لیے ہتھیا لیا کرتی تھیں۔ اب اس میں کتنا جہیز بنتا تھا،

وہ جانتی تھی۔ وہ احمق یا نادان نہیں تھی کہ سمجھ نہ سکے آخر کو اتنے پیسوں کا کیا ہوتا ہے، مگر خود کو بہلا لیا کرتی تھی کہ پھپھو واحد رشتے دار رہ گئی تھیں اس کی۔

ان کے علاوہ یعنی تھی جو اس کی بچپن کی دوست تھی۔ بابا کے دوست اور پڑوسی چاچا بشیر کی اس لڑکی سے اسے بہت اُنسیت تھی۔ یعنی بھی اپنی عمر کے بڑے پن کے باعث اکثر اسے سمجھاتی رہتی تھی، مگر یہاں اثر نہیں تھا۔ وہ احمقوں کی جنت میں رہنے پر راضی و مسرور تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر بلگرامی کے بہترین علاج کے پیش نظر گرینی اگلے ہفتے ہی گھر آ گئیں، تاہم اس مرتبہ کمزوری اس قدر ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر نے بے حد احتیاط کی تاکید کی تھی۔ شاذان ندامت اور تاسف سے سر نہیں اٹھا پا رہا تھا کہ گرینی کا بی پی اب تک نارمل نہیں تھا۔

گو کہ کرسٹینا اور اس کی ناراضگی کا خیال غالب تھا، مگر گرینی کی صحت کے پیش نظر اس نے واپسی کا پروگرام مؤخر کر دیا۔ اس دوران آفس میں جانے لگا تھا۔ تاہم واپسی پر جلدی گھر آ جاتا۔ گرینی کے لیے بھی دوسری تجربہ کار نرس رکھ دی تھی لیکن پھر بھی اسے ان کی طرف سے فکر لگی رہتی تھی۔

اس شام بھی وہ جلد گھر آ گیا۔ تین چار بار آفس سے فون کرتا رہا۔ نرس نے بتایا کہ گرینی کی طبیعت آج کچھ گری گری سی ہے تو فوراً چلا آیا۔  
”کیسی ہیں گرینی؟“

کپڑے تبدیل کیے بغیر وہ اُن کے کمرے میں چلا آیا تھا اور گرینی کی تو جیسے جان تھی اس میں ... اُسے دیکھ کر نقاہت کے باوجود مسکرا دیں۔ محبت سے بولیں:  
”ٹھیک ہوں بیٹا، بس تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں۔“

اس نے متاثر ہوتے ہوئے ان کے نحیف ہاتھ تھام لیے۔ ”آج کا دن کیسا گزرا؟“  
”اچھا گزر گیا، شام کو تم گھر آتے ہو تو بیٹا اسی انتظار میں دن کٹ جاتا ہے۔ ہاں جب چلے جاتے ہو تو مہینے نہیں کٹتے دن اور ہفتے نہیں گزرتے۔“ اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ سر آہ بھر کر رہ گئی تھیں۔  
موضوع کچھ ایسا تھا کہ اس نے نظریں چرائیں۔ وہ جانتی تھیں اس لیے نظر انداز کرتے ہوئے بولیں:

”تم نے کچھ کھایا یا اب کھانا لگواؤں؟“  
”نہیں گرینی بھوک نہیں ... بس آپ سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے ... میں راستے میں یہی سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ کہیں آپ سو نہ رہی ہوں۔ بٹ تھینکس ایسا نہیں ہے۔“ گرینی کی طبیعت بحال دیکھ کر اس کا تو جیسے سیروں خون بڑھ رہا تھا۔

گرینی بردباری سے مسکرا دیں ”ہاں بیٹا! بندے کو تنہائی اور خالی گھر کاٹنے کو ہی دوڑتا ہے۔ مجھے دیکھ لو، سارا دن تمہاری راہ تکتی ہوں۔ نوکروں کی لائن لگی ہے، مگر بات کرنے کو کوئی دوسرا شخص نہیں ملتا۔ تمہیں بھی اب گھر بسا لینا چاہیے شانی بیٹا... بیٹا یہ زندگی تنہا نہ کسی سے گزری ہے نہ گزر سکے گی۔ جاتے جاتے تمہاری اولاد کو دیکھ لوں، اس گھر کو بہو مل جائے... میرے ارمان پورے ہو جائیں تو سکون سے آنکھیں بند...“

”پلیز گرینی... آپ نے پرامس کیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔“ اس نے یکدم ان کے ہاتھوں کو لبوں سے لگا کر شاکی لہجے میں یاد دہانی کرائی تو وہ اس کے بچپنے پر ہنس پڑیں۔

”میرا پرامس یاد ہے، اپنا بھول گئے... یاد نہیں اپنے ڈیڈی سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ میرے فرمانبردار رہو گے؟“

”تو وہ تو میں ہوں؟“ وہ بھی شرارت سے مسکرایا۔

”خاک فرمانبردار ہو... آج تک بہو کے لیے گھر کو اور مجھے ترسایا ہوا ہے... بیٹا نوکریاں، کاروبار تو سب لوگ کرتے ہیں، مگر گھر بھی بساتے ہیں اس کے لیے الگ سے کوئی زندگی نہیں ملتی بندے کو... ساری عمر صرف پیسہ جوڑنے میں ہی نہیں گزارنا چاہیے۔“

”تو یہ میں نے کب کہا گرینی؟“ شادی کی بات پر وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”پھر کیا بات ہے؟ اتنی بڑی دُنیا میں تم تو ملکوں ملکوں گھومتے ہو... کیا کوئی لڑکی تمہیں ایسی نہیں ملی جو ہمارے خاندانی وقار اور تمہارے پسند کے مطابق ہو؟“

اب گرینی نے بہت واضح الفاظ میں کہتے ہوئے گھیرا تھا اُسے۔ وہ گہری سانس لیے ہوئے اُٹھ گیا۔ (ملی تو ہے گرینی میری پسند اور محبت سب کچھ وہی ہے مگر یہ خاندان اور اس کی روایات...)

”لو اب چلے کہاں؟ میرے سوال کا جواب نہیں دو گے؟“

”آپ کے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس گرینی۔“ وہ دوبارہ ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ چہرے سے ہی پریشانی اور پشیمانی جھلک رہی تھی۔ گرینی نے شفقت سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

”تو پھر یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو... میں نے بہت اچھے گھرانوں کی لڑکیاں دیکھی ہیں تمہارے لیے... تم ہاں تو کہو، دیکھنا کیسی چاندسی دلہن لاؤں گی۔“

”پلیز گرینی! کیا اس کے بغیر زندگی نہیں گزر سکتی؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جھلا گیا تھا۔

گرینی ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئیں اور پھر ان کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر دکھ اُتر آیا تھا۔ شاذان کو ان کا اس طرح دیکھا اُسے انگاروں پر دھکیل گیا۔

”آئی ایم سوری گرینی... میں ان فیکٹ کچھ پریشان تھا۔“

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں بیٹا کہ شادی کرلو... عورت سے گھر کا دل و نظر کا سکون وابستہ ہوتا ہے... شوہر گھر آئے تو اپنی میٹھی مسکان سے وہ سارے درد، ساری تھکن سمیٹ لیتی ہے۔ بہت سکون اور طمانیت ہے اس کی ذات میں۔“ وہ شرمندہ ہوا تو گرینی نے بردباری سے نظر انداز کر دیا۔ (کرٹینا کا وجود ہے میرے لیے گرینی) ”جی گرینی...“ وہ تابعداری سے کہہ کر سر جھکا گیا۔

”تو پھر میں دیکھوں لڑکیاں!“

”اوہ کم آن گرینی۔“ میں ایک شادی کے لیے راضی نہیں اور آپ لڑکیاں تلاش کر رہی ہیں۔ کیا بیک وقت ہی چار کرانے کا ارادہ ہے۔“ اس نے فوراً موضوع کا رخ تھوڑا موڑ دیا تو گرینی مسکرانے لگیں۔

”بہو تو اس گھر میں ایک ہی آئے گی کیونکہ اتنا مجھے معلوم ہے کہ تم میں انصاف کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ایک کو ہی نبھا دو تو بہت ہے۔ ہاں البتہ پوتے پوتیاں بھلے کتنے بھی ہوں؟“ وہ بذلہ سنجی سے کہہ اٹھیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

پھر باتوں کا رخ دوسری جانب مڑ گیا۔ تو وہ کچھ دیر اور ان کے پاس بیٹھا رہا، تاہم اس روز اسے واضح طور پر اندازہ ہوا کہ گرینی اس کی شادی کے لیے واقعتاً سنجیدہ ہو گئی ہیں اور یہ صورت حال اس کے لیے سخت پریشان اور فکر انگیز تھی۔

ایسے میں صرف احتشام کا کندھا ہی ایسا تھا جس پر سرکڑا کر وہ دل کو بوجھ ہلکا کر سکتا تھا۔ سوا اُسے بھلا بھیجا۔ صبح میں اسے کچھ مصروفیت تھی چنانچہ دوپہر میں آفس آنے کا وقت لے لیا۔

☆.....☆.....☆

”ہاں تو مس ایما... آپ کے پچھلے چار دن کے کام سے میں کافی سیٹفائی ہوا ہوں، البتہ آپ کی تعلیمی قابلیت کو انگور کرنا ہمارے لئے آسان نہیں۔“ لیٹر ڈکیٹیٹ کرانے کے بعد اس نے ڈائریاں اور پن وغیرہ اٹھاتی ہوئی ایما کو دیکھتے ہوئے اچانک ہی کہہ دیا تھا۔

بات خاصی خلاف توقع تھی، وہ کچھ چونک کر سنبھل گئی۔

شاذان کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں جو سبز کاٹن کے سوٹ میں اپنا سادہ سا روپ لیے اور بھی پرکشش لگ رہی تھی خصوصاً کم سنی اور نا تجربے کاری نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں سادگی کا رنگ بھر دیا تھا۔ ایسے میں وہ حیران پریشانی سے سامنے والے کو دیکھتی دو آتشہ ہی لگتی تھی۔

”بج... جی...“ پلکیں جھپک کر اس نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا۔ شاذان کو واضح طور پر اس کے مایوس ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے نجانے اس نے کیا کچھ سوچ لیا تھا کہ چہرے تھکن اُتر آئی۔

”جی... لہذا میں نے یہی ڈیسائیڈ کیا ہے کہ فی الحال آپ کو کلرک اسٹاف کے ساتھ اسی سلیری پر ایڈجسٹ

کر دیا جائے اور جب آپ گریجویشن کر لیں گی تو پھر آپ کو اسی پوسٹ پر ممکن ہوا تو دوبارہ اپائنٹ کریں گے یا پھر آپ کی کوالیفیکیشن لیول پر کوئی دوسری پوسٹ آفر کریں گے کہ بہر حال آپ کے فادر میرے ڈیڈی کے قابل اعتماد ورکر رہے ہیں۔“

نظروں کا رخ دوسری جانب کرتے ہوئے اس نے پروفیشنل انداز میں کہا تو وہ بے بسی سے ہونٹ چبا کر کھڑی ہو گئی۔ آج تو قریشی صاحب بھی نہیں تھے کہ اُن کی موجودگی کی ڈھارس ہوتی۔ وہ کیا کہتی، خاموش رہ گئی۔ جاب اس کی ختم نہیں ہوئی تھی، مگر سبکی کا احساس ہوا تھا اُسے جس نے آنکھوں میں کنکر سے بھر دیے تھے۔ ”میں چلو سر۔“ بمشکل خود کو کہنے پر اُکسایا۔

”ہوں ...“ شاذان کے لیے اس کا اس طرح خاموش ہو جانا متوقع تھا اس لیے بغور گہری نظر سے دیکھتے ہیں اُسے جیسے اجازت دی۔

لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی تو سامنے بیٹھی عینی کو دیکھ کر اپنی آزر دگی چھپا نہ سکی۔ عینی بھی عقابی نظروں رکھتی تھی۔ فوراً تاڑ گئی کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ پوچھنے پر اُس نے حرف بہ حرف بتا دیا۔ ”لو تو اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات ہے ... تمہیں تو سیلری سے مطلب ہونا چاہیے ... بھلے ...“ ”وہ تو ٹھیک ہے، مگر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاذان صاحب مجھے یونہی بہلا رہے ہوں ... اس پوسٹ سے ہٹا کر وہ مجھے جاب ہی سے نکال دیں ... دوسری طرف پھپھو نے الگ پریشان کر دیا ہے۔“ اُسے مکمل طور پر فکر مند دیکھ کر عینی چونک سی گئی۔

”تمہاری پہلی بات سے تو میں ہرگز متفق نہیں ... شاذان صاحب لاکھ غصیلے اور سخت مزاج کے سہی لیکن اتنا میں جانتی ہو کہ وہ زبان کے پکے ہیں ... تمہیں کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرنے کے لیے کہا ہے تو ضرور ایسا کریں گے، خواہ اُنہیں تم کو اپنے گھر میں خانساماں کی نوکری ہی کیوں نہ دینی پڑے، دیں گے ضرور۔“

سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ نیم مزاحیہ انداز میں بولتے ہوئے ہنس پڑی تو اپنے روم سے نکلتے ہوئے شاذان کی سماعتیں بلا ارادہ عینی کی طرف متوجہ ہو گئیں جو حسب عادت فل والیوم میں بات کر رہی تھی۔

”پلیز عینی مذاق مت کیا کرو ... کیا ایک ایف ایس سی پاس لڑکی کو خانساماں کی جاب دینی چاہیے؟“ وہ اپنے تفکر میں مذاق سمجھ رہی تھی، نہ مزاح، روہانسی ہو گئی۔

”نہیں یہ تو سراسر زیادتی ہوگی۔ تو چلو یوں کرو ان سے کہہ کر ان کے گھر میں اُن کی دادی کی نرسنگ اپنے ذمے لے لو۔ سنا ہے بوڑھی خاتون ہیں، ثواب بھی ملے گا اور تنخواہ بھی۔“ عینی بظاہر ہنسی لیکن درحقیقت وہ بھی کچھ کم پریشانی نہیں تھی۔ ایما کے حالات اس سے بہتر کون جانتا تھا۔

”خدا کے لیے عینی تم چپ کر جاؤ، میرا دل پہلے ہی بہت پریشان ہے۔“ اس نے جیسے ہاتھ جوڑ دیے۔

”کیوں؟ کیا پھر وہ بھوت آیا تھا تمہاری پھپھو کا جواب لینے؟“ عینی نے بھنویں اُچکاتے ہوئے قیاس لگایا تو وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکا گئی۔ آنکھوں میں احساس بے بسی نے آنسو بھر دیے تھے۔  
 ”اوہ!“ عینی سیدھی ہو بیٹھی۔

”اب بتاؤ میں کیا کروں عینی؟“ اس کی آواز بھیگ چلی تھی۔ ”پھپھو تو کچھ سُننے پر تیار نہیں... اُنہیں جلدی سوار ہوگئی ہے اور دوسری طرف جاب بھی خطرے میں نظر آ رہی ہے۔“  
 ”اور جاب ہاتھ سے جانے کا مطلب ہے کہ رشتہ بھی ختم ہو جانا کیونکہ وہ اود بلاؤ تم سے صرف جاب کی وجہ سے ہی شادی کر رہا ہے تاکہ خود پڑا گھر میں تمہاری کمائی پر عیش کرے۔ تمہارے بابا کا بنایا مکان اسی نظریے سے اس نے پھپھو کے حوالے کیے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے کہ ابھی تو شادی کر کے تمہاری کمائی پر عیاشی کرے اور اس کے بعد جب تمہاری پھپھو اس جہان فانی سے کوچ کر جائیں تو یہ مکان بھی ہاتھ آجائے۔ یعنی خریدی ہوئی چیز بھی اپنی اور ادا کی ہوئی قیمت بھی واپس۔“ عینی کی صاف گوئی پر وہ واقعی سسک اُٹھی۔  
 ”پتہ نہیں میرے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے عینی... بابا کے انتقال کے بعد میں اتنی بے یار و مددگار ہو جاؤں گی، مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔“ میز سے سرٹکا کر اب وہ باقاعدہ رو پڑی تھی... عینی بے چین سی ہو کر اس کے پاس اُٹھ آئی۔

”پلیز ایما! اس طرح مت کرو... دیکھو رونے سے کوئی مسئلہ آج تک حل نہیں ہوا... چلو چہرہ صاف کرو... دیکھو کہیں کوئی آنہ نہ جائے۔“ باہر کھڑے شاذان حیات کی موجودگی سے یکسر بے خبر وہ دونوں اپنے آپ میں گم تھے۔ اندر خاموشی چھا گئی تو وہ چپ چاپ نچلی منزل پر بنے کرائفنگ سیل کی طرف چل دیا۔ تاہم ذہن میں ایما کی سسکیاں اور عینی کے الفاظ اب تک گونج رہے تھے۔

”پتا نہیں یہ دُنیا کہاں جا رہی ہے۔ محض چند گز کے مکان کے لیے لوگ انسانی جذبوں اور انسانی زندگیوں کا سودا کرنے لگتے ہیں۔ پھوپھی کا رشتہ کتنا قریبی اور کس قدر حقیقی و خونی رشتہ ہے، مگر اس میں بھی مطلب، مفاد پرستی اور خود غرضی کا زہر شامل ہو گیا ہے۔“ کافی دیر تک اس سوچ نے اس کے ذہن کو منجمد کیے رکھا۔

☆.....☆.....☆

لنچ کے بعد کافی دیر تک احتشام کا انتظار کرتا رہا، سو جو نہی وہ آیا ساری بات اسے کہہ سنائی۔  
 ”دیش ویری گڈ... تو اب یہ بتاؤ کہ تم شادی کب کر رہے ہو؟“ زبردستی اس سے مصافحہ کرتے ہوئے وہ مزے سے پوچھ رہا تھا۔

شاذان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”بی سیریس احتشام! آئی ایم ریلی ویری اپ سیٹ... میں نے تمہیں یہاں یہ مذاق کرنے کے لیے نہیں بلایا۔“



”اوہ! میں سمجھا شاید چھوڑے کھلانے کا ارادہ ہے۔“

وہ ہنوز اسی موڈ میں گویا ہوا تو شاذان کی غصیلی نظریں اس پر جم گئیں جس کے باعث اُسے سنجیدہ ہونا پڑا۔  
”دیکھو شاذان! ہمارے بزرگوں کا واحد اثاثہ ہم ہی ہیں، وہ اگر ہمیں محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ اُن کا حق ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اُنہیں اپنی ذات سے خوشی اور سکون دیں۔ انکل کی ڈیڑھ کے بعد گرینی کا واحد خواب اور ارمان تم ہو ... تم تمہاری بیوی تمہارے بچے اُن کی تمام تر سوچ اُنہی چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔“  
”مگر میری بھی تو کوئی سوچ، کوئی لائف ہے شامی۔“ وہ تیزی سے بات کاٹ گیا تھا۔ احتشام نے اُسے بھنویں اُچکاتے ہوئے قصداً خفگی کا تاثر دیا۔

”اگر تمہارا مطلب کرسٹینا سے ہے تو معاف کرنا یار، جس عورت نے تمہاری خاطر اپنا لائف اسٹال تک نہ چینج کیا ہو، مذہب اور سوچ تو دور کی بات ہے، میں اسے گرینی جیسی محبت کرنے والی ہستی سے کمپیئر نہیں کر سکتا۔ Its most unfair اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہارے ساتھ دور تک چل سکتی ہے ... یار وہ ایک غیر مذہب اور شرم و حیا سے دور ایک ...“

”احتشام پلیز! تم یہ شاید بھول رہے ہو میں نے تمہیں یہاں کرسٹینا کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے لیے نہیں، گرینی والے مسئلے کے حل کے لیے بلایا تھا۔“

ایک بار پھر وہی صورت حال تھی۔ شاذان کے تیکھے تیور اور احتشام کا غصہ جسے اس نے بمشکل ضبط کیا۔  
”تو تم گرینی والے مسئلے کے لیے کیسا حل چاہتے ہو؟ ایسا جو تمہیں خوش کر سکے یا وہ جو اُنہیں خوش دے سکے۔“

”ایسا جس سے دونوں ہی باتیں ہوں۔“ وہ بھاری لہجے میں بولا۔

”تو پھر یہاں شادی کرلو۔“ احتشام نے اچانک ہی کہہ دیا تھا۔

”شادی؟ آر یو کریزی احتشام؟ ...“

”دیکھو شاذان میں ابھی گرینی کی طرف سے ہوتا ہوا آیا ہوں ... جانتے ہو کیوں؟ اُنہوں نے بلایا تھا مجھے کہ تمہیں شادی کے لیے کنونس کروں ... یار اُن کی صحت بڑے نازک موڈ پر ہے۔ ہارٹ پر اہلم از ناٹ آجوک ... تمہیں اسے سیریس لینا پڑے گا۔“ احتشام نے اُسے یہ سب کہہ کر جیسے کسی مشکل میں ہی ڈال دیا تھا۔

”ڈیم اٹ ... اب میں گرینی کو کس طرح سمجھاؤں؟“

”اُنہیں چھوڑو ... خود کو کنونس کرو اور شادی کے لیے ہاں کہہ دو۔“ احتشام نے سیدھے سبھاؤ اسے مشورہ دیا جس میں حتمی پن موجود تھا۔

”شامی کیا تم مذاق کر رہے ہو؟ ... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں میریڈ بندہ ہوں ... آل ریڈی شادی

شدہ ... مجھے اول تو کوئی اپنی بیٹی دے گا نہیں ... دوسرے میں اس کے لیے راضی بھی نہیں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں کہہ اٹھا تھا۔

”راضی تو تمہیں ہونا ہی پڑے گا۔ کیونکہ میں اینز آڈاکٹر تمہیں گرینی کی صحت سے کھیلنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا ... سیکنڈ لی رہ گئی لڑکی دینے کی بات تو آج کے دور میں تم جیسے ویل سیٹلڈ ویل آف اور ویل ایجوکیٹڈ بندے کو لڑکیوں کی کمی نہیں۔“

کرسی کی پشت سے احتشام نے سر ٹکاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تو وہ خشمگین نظروں سے اُسے گھور کر کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے توجہ مبذول کرائی۔

”یس ... کم ان۔“ کہتے ہی دروازہ آہستہ سے کھلا۔

اندر آئی ایما کچھ جھج سی گئی ... احتشام نے بلا ارادہ اس کی طرف دیکھا۔  
”سر آپ نے یہ فائل منگوائی تھی۔“

شاذان کے سخت لہجے میں ”جی“ کہہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ نروس ہو گئی تھی۔  
تھینکس ... یہاں رکھ دیں اور ہاں ایما دو کافی کا آرڈر کریں اور کسی کو اندر نہ بھیجے گا۔ اس پر سنل میننگ  
...! “بمشکل اپنا لہجہ اس نے دھیمہ کیا تھا۔ احتشام کی حساسیت نے یہ محسوس کر لیا تھا۔  
”آپ کی تعریف؟“ اس کے جاتے ہی احتشام نے سوال کیا تھا۔

”پی اے ہیں میری۔“ وہ بیزار سا ہو رہا تھا۔

”تمہاری پی اے؟“ احتشام نے حیرانی سوال کیا

”ہاں بس یہ قریشی صاحب بھی ایسے ہی سلیکشن کر لیتے ہیں۔ کرسی میں آ کر رکھ لیا ہے اسے ... جسٹ ٹیل  
می ... کیا یہ لڑکی اس لائق ہے کہ اسے پی اے بنایا جاتا؟“ احتشام کے حیرت کا اظہار کرنے پر وہ بگڑے ہوئے لہجے  
میں بولا۔

”نہیں ... ایسی لڑکی واقعی اس سیٹ کے لیے موزوں نہیں ... اسے تو گھر میں ہونا چاہیے تھا ... کافی ینگ اور  
انوسنٹ ہے۔ یہ لعل و گوہر ضائع کرنے کے لیے نہیں مَحمل میں لپیٹ کر محفوظ مقام پر رکھنے کے لائق ہوتے ہیں ...  
جیسے لڑکی کے لیے اس کا گھر ... بائی دا وے کیا یہ میریڈ ہے؟“

توصیفی لہجے میں کہتے کہتے وہ سوالیہ ہو گیا تھا۔ چہرے پر اچانک کسی گہری سوچ کا تاثر در آیا تھا۔

”کم آن ... تمہیں وہ میریڈ لگتی ہے؟ ہارڈ لی ٹین ایجر ہے ... اسکول گونگ بچوں جیسی تو شکل ہے اس کی ...  
ذرا ساخت لہجے میں پکار لو یا تیکھی نظروں سے دیکھ لو تو گویا melt ہونے پر تل جاتی ہیں میڈم ...“ شاذان نے  
اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ لہجے سے تعریف جھلک رہی تھی نہ تنقید۔

”ہوں ... گویا اچھی لگی تمہیں ...“ احتشام اب کے آگے کی جانب جھک آیا تھا۔ شاذان کے اندر خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”واٹ ڈو یو مین ... اچھی لگی ... شی از مائی پی اے شامی۔“ ’پی اے‘ پر بطور خاص زور دے کر بولا تھا وہ ... ”اور پی اے کا مطلب ہے پرسنل اسٹنٹ۔“

”ہاں تو... بیوی سے زیادہ پرسنل اسٹنٹ کون ہو سکتا ہے؟“ وہاں سے اطمینان بھرا جواب موصول ہوا تھا۔ شاذان بری طرح ہدکا۔

”احتشام تم حد سے بڑھتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں ...“

”پلیز شاذان ... پہلے سکون اور اطمینان سے میری بات سُن لو۔“ یکدم اس کی بات کاٹ کر احتشام سنگین حد تک سنجیدگی اختیار کر گیا تو اُسے خاموش ہونا ہی پڑا۔ احتشام کے لہجے میں اُسے خاص بات محسوس ہوئی تھی۔ سوالیہ نظریں اس پر ٹکا دیں۔

”میں نے تم سے پہلے کبھی کچھ چھپایا نہیں مگر پچھلے دنوں ایک بات تم کو بتا نہیں سکا تھا۔“

”بات! کون سی بات۔“

”یہی بات کہ گرینی کی کنڈیشن بہت سیریس ہو گئی ہے ... پچھلے بائی پاس کے باوجود ان کو اکثر انجانا اسٹروک ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے لنگز (Lungs) دھیرے دھیرے کام چھوڑتے جا رہے ہیں ...“ دھیمی آواز میں ڈاکٹر احتشام نظریں جھکائے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”واٹ شامی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ شاکد رہ گیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں شاذان ... میں نے تمہاری پریشانی کے پیش نظر تمہیں اس وقت بتانا ٹھیک نہیں سمجھا، مگر اب تم سے چھپانا ممکن نہیں رہا۔ میں نہیں چاہتا تھا گرینی کوئی دکھ لے کر اس دُنیا سے جائیں۔“

احتشام کے لہجے میں دکھ ہی دکھ گھلا ہوا تھا۔ شاذان نے اُنکلیاں بالوں میں پھنسا لیں۔

اپنی طبیعت کی لا پرواہی اور مزاج میں درشتی کے باوجود یہ سچ تھا کہ وہ گرینی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ کرسٹینا اس کی زندگی میں تین سال پہلے آئی تھی جبکہ گرینی نے اُسے دس سال کی عمر سے پالا تھا۔ جوان کیا تھا اپنے ہاتھوں سے۔ چار سال پہلے وہ پڑھنے گیا تو کرسٹینا نے اُسے اپنے حسن کے جال میں پھنسا لیا اور وہ اس کے راستے پر چل پڑا، مگر گرینی کی محبت اب بھی اس کے دل میں تھی۔

”اوہ مائی گاڈ۔“ وہ حقیقتاً شدید دکھ محسوس کر رہا تھا۔ جن سے محبت ہوتی ہے۔ ان ہستیوں سے جدا ہونے کا خیال ہی رگوں میں بہتے خون کو منجمد کرنے لگتا ہے۔ دھڑکنیں تھمتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

”اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ تم گرینی کو زیادہ سے زیادہ وقت دو اور اُن کی کوئی بات نہ ٹالو۔ مجھے دیکھو ماما

کی زندگی میں کیریئر بنانے اور ایف ایس سی کرنے کی دھن نے مجھے ان کے خواب پورے کرنے کی مہلت نہ دی اور جب وہ اس دُنیا سے چلی گئیں تب واپس آکر میں نے شادی کی، مگر یقین کرو شاذان! آج بھی اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں تو ماما کی یاد دل کو آزدہ کر جاتی ہے کہ ان بچوں کو اپنی گود میں کھلانے کا ارمان لیے لیے وہ ہم سب کو چھوڑ گئیں۔“

احتشام اپنی والدہ کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا تھا۔ شاذان نے سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کی طرف دیکھا پھر تسلی دینے کے انداز میں اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے تھپکا۔

”اسی لیے کہتا ہوں یار، وقت کی لگائیں تھام لے۔“

احتشام بمشکل مسکرا سکا تھا۔ شاذان نے گہری سانس بھر کر پشت کرسی کی بیک سے ٹکادی۔

”خوشی بیماری کا سب سے اچھا توڑ ہے ... گرینی کو تنہائی کے عذاب سے نکالو ... تنہائی، ڈپریشن کی جڑ بنتی ہے اور ڈپریشن سے ہی ان کا بی پی نارمل نہیں رہتا ... یہ لڑکی تمہاری پی اے مجھے یکدم بے حد اچھی لگی ہے ... سادہ اور گھریلو سی، ایسی لڑکی اگر تمہاری بیوی بنی تو یقیناً گرینی کی بہتر دیکھ بھال کر سکے گی ... ساتھ ہی تمہیں بھی زیادہ پریشانی نہیں ہوگی تم کبھی کبھار لندن کا چکر بھی لگا لیا کرنا۔“

شاذان کے چہرے سے قائل ہونے کا تاثر پڑھتے ہوئے احتشام نے آخری ضرب لگائی تو وہ چونکا ... بے اختیار کہہ اُٹھا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ میں کرسٹینا کی جگہ کسی کو نہیں دے سکتا۔“

”تو میں نے کب کہا کہ اس کی جگہ کسی کو دو، مگر کسی ایک کو زندگی میں شامل کر لینے سے اور دوسرے لوگوں کے لیے گنجائش ختم تو نہیں ہو جاتی۔“

احتشام اُسے گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تو وہ محض غائب دماغی سے اُسے دیکھنے لگا۔ اسی دوران کافی آگئی تو وہ دونوں چپ چاپ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زندگی میں کئی مرتبہ ایسے مواقع آتے ہیں جب انسان کو اپنی ذات سے باہر نکل کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ کسی اپنے کی زندگی کی خاطر ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں، جو براہ راست انسان کی اپنی زندگی کو انتہائی مشکل راستوں کا مسافر بنا دیتے ہیں۔ اُسے بھی یہی سفر اختیار کرنے کا اذن ملا تھا۔

☆.....☆.....☆

احتشام نے دوسرے دن ہی اُسے گرینی کی میڈیکل رپورٹ کی مکمل فائل دے دی تھی ... جسے پڑھ کر اس کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ بہت گھبرائے ہوئے انداز میں اس نے احتشام کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا کہیں اور بھی اس بیماری کا ٹریٹمنٹ نہیں ہو سکتا۔“

”ابروڈ (Abroad) جانے کے لیے گرینی میں اسٹیمنٹا نہیں ... کوئی بھی ڈاکٹر اس کنڈیشن میں اُنہیں ٹریول کرنے کی جازت نہیں دے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ خود بھی فلاحی کرنے سے خوفزدہ ہیں۔“

احتشام نے اس کے سوال کا اصل جز نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے زیرک ذہن نے محسوس کیا تو یلخت وہ شدید مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکنے لگا۔

”بی بریو شاذان! ابھی بہت کچھ تمہارے ہمارے ہاتھ میں ہے، نکلا نہیں ... کم از کم اپنی ذات سے تو تم گرینی کو زندگی نہ سہی زندگی کی چند خوشیاں تو دے سکتے ہوناں!“ احتشام نے اس کا شانہ تھپتھپایا تو وہ ضبط کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے اور آنکھوں میں سرخی اُتر آئی۔

پھر کافی دیر تک احتشام اُسے ناصحانہ انداز میں سمجھاتا رہا۔ اس نے سمجھا، یا نہیں بس خاموشی اختیار کیے رکھی۔ کچھ دیر بعد گرینی نے ان دونوں کو بلا بھیجا تو وہ چہرے پر مصنوعی بشاشت سجائے احتشام کے ساتھ لونگ روم میں چلا آیا۔

احتشام نے گرینی کا چیک اپ کیا اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے بولا:

”دیش ویری گڈ گرینی! آپ نے تو ماشاء اللہ کافی ری کور کیا ہے ... لگتا ہے آج کل میڈیسن بالکل ٹھیک طرح سے لے رہی ہیں آپ۔“ اپریٹس رکھتے ہوئے وہ واقعی خوش نظر آ رہا تھا۔

”بس بیٹا میری میڈیسن تو تم سب ہو ... شانی پاکستان میں ہو تو تمہارے چکر بھی زیادہ لگتے ہیں ... گھر میں رونق آ جاتی ہے، اچھا لگتا ہے بس اب تو دعا ہے کہ جلدی سے گھر میں بہو آجائے۔“ گرینی کی کمزور آواز خوشی سے بوجھل تھی۔ شاذان نے بے چینی سے پہلو بدلا ان کی بات پر۔

”تو پھر دیر کس بات کی ہے گرینی ... آپ کہیں تو میں بھابھی ڈھونڈ کر لاؤں؟“ احتشام کچھ زیادہ ہی مستعد ہو رہا تھا۔ شاذان ضبط کیے رہا کہ بہر حال گرینی اُسے بے حد عزیز تھیں۔

”لو پہلے اپنے دوست کو تو سمجھاؤ ... کہیں یہ نہ ہو کہ شادی والے روز اُسے ڈھونڈنا پڑے۔“ گرینی نے بے ساختہ کچھ ایسے لہجے میں کہا، وہ دونوں ہی مسکرا دیے۔

”ارے نہیں گرینی! اس کی تو اب آپ فکر نہ کریں ... کان سے پکڑ کر لائن حاضر کردوں گا ... کر دیجیے گا کورٹ مارشل۔“ ہنستے ہوئے احتشام نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

”نہیں بیٹا ... میں جبر و زبردستی کی قائل نہیں ... یہ بندھن تو خوشی سے ہی بندھتا اچھا لگتا ہے۔“ گرینی نے یکدم خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اُسے احتشام کی سرزنش سے پر نظروں کے باعث فوراً مسکرانا پڑا۔

”آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے گرینی ... البتہ لندن میں جو برنس پھیلا ہوا ہے اُسے چھوڑ کر میں یہاں نہیں بیٹھ سکتا ... میرا جتنا نقصان ہوگا، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکیں گی؟“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ پیش بندی کر

گیا تھا۔ احتشام نے اس کی بات پہ بے ساختہ اُسے دیکھا۔

”نہ بیٹا میں نے تمہیں اپنا نقصان کرنے کے لیے نہیں کہا ... البتہ اتنی گزارش ہے کہ جب تک میری سانسیں چل رہی ہیں، تم بہو کے ساتھ ادھر آتے رہنا۔“ گرینی کچھ رنجیدہ ہو گئی تھیں۔

احتشام نے دیکھا تو تیزی سے پتھویشن سنبھالتے ہوئے بولا ... ساتھ ہی اُسے بھی گھورا۔

”کم آن گرینی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی وائف کو لے جائے گا، دراصل شاذان اتنی جلدی اپنا بزنس اور ساری پراپرٹی وائنڈ اپ کر کے یہاں نہیں آ سکتا۔ اس میں کچھ عرصہ لگ جائے گا، جس کی وجہ سے اُسے آتے جاتے رہنا ہوگا۔“

”یس گرینی! شامی از رائٹ ... یہی بات ہے۔“

اس نے کہا تو گرینی کچھ مطمئن سی ہو گئیں۔ باتوں باتوں میں لڑکی تلاش کرنے کی بات نکلی تو احتشام نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ شاذان فون سننے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

”ایک لڑکی ہے میری نظر میں گرینی ... بہت شریف، کم سن، خوبصورت اور خوب سیرت ... آئی ہوپ آپ کو پسند آئے گی۔“

”کہاں ہے وہ بچی، مجھے ملاؤ تو بیٹا۔“ گرینی خاصی خوش ہو گئی تھیں ... اس بیماری نے اتنی سکت نہیں چھوڑی تھی ان میں کہ بہو کی تلاش کے لیے خود نکل جائیں۔ احتشام پر انہیں بھروسہ بھی بہت تھا۔

”ملاؤں گا گرینی مگر ایک مسئلہ ہے ... لڑکی مڈل کلاس ہے ... عرصہ ہوا، والدین **انتقال** کر چکے ہیں ... اپنی پھوپھی کے ساتھ رہتی ہے ... ویسے خاندان اچھا ہے ... پارٹیشن سے پہلے ان کا خاندان اچھے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔“

”ہاں بیٹا! زمانہ بھی کبھی کسی کا رہا ہے، مگر بہر حال مجھے لڑکی کی سیرت سے علاقہ ہے۔ خواہ مالی حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں؟ اللہ کا کرم ہے اس گھر میں کسی شے کی کمی نہیں ... البتہ تم اپنے دوست سے پوچھ لو ... جانے وہ ایسے گھرانے میں بیاہ کرنا چاہے بھی کہ نہیں۔“ گہری سانس بھرتے ہوئے کہہ کر انہوں نے اپنا عندیہ دے دیا، تاہم شاذان کی طرف سے وہ متفکر تھیں۔

”ارے اس کی فکر چھوڑیں ... اس کا ذمہ میرا ... اس کی پسند کے بغیر ہاں نہیں کریں گے ... بس اب آپ مٹھائی کھلوائیے گرینی۔“ احتشام ہنس پڑا تھا۔ ریلیکس ہوتے ہوئے بولا۔

”ابھی لو بیٹا! خدا تمہیں خوش رکھے۔“ گرینی کا نقاہت زدہ چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا۔



شاذان تین دن سے آفس نہیں آرہا تھا، لہذا اس کا مسئلہ ہنوز اٹکا ہوا تھا۔ روز ہی وہ منتظر رہتی کہ جانے سے

اُسے کہاں ایڈجسٹ کیا جائے گا کہ اس روز اچانک وہ چلا آیا۔ آتے ہی اس کی پیشی ہوئی آفس میں۔  
”جی سر ...“

ذرا دیر بعد وہ حاضر تھی۔ شاذان نے فون بند کرتے ہی اس کی طرف رانگ چیئر گھمائی۔ نظریں بے اختیار اس پر جا ٹھہریں جسے احتشام نے ایک نظر میں ہی پسند کر لیا تھا۔  
اُس بلو کاٹن کے سفید کڑھائی والے کرتے شلوار میں ملبوس روٹین کے سادے سے حلیے میں اس کی سرمئی آنکھیں گہنی پلکوں کی باڑ سمیت جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں نوٹ بک تھامے وہ حکم کی منتظر کھڑی تھی۔  
کمر پر جھولتی سیاہ بالوں کی چٹیا اور چہرے کے اطراف ہالہ بنائے خوبصورت لٹیں میں میل اپ کے بغیر کانوں میں سونے کی درمیانی سائز کی بالیاں تھیں۔ وہ دراز قد تھی۔  
اس کی نظروں کا ارتکاز بھی ایما شاہنواز کو نروس کر گیا تھا۔ گہبرائے گہبرائے انداز میں اس نے کئی بار ہونٹ کاٹے۔ سمجھ میں نہیں آیا کس طرح اُسے مخاطب کرے۔ صد شکر وہ خود ہی بول اٹھا۔  
”ہیو آسیٹ مس شاہنواز۔“

”تھینک یو سر۔“ وہ مرے مرے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ شاذان کے لہجے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی خاص بات کرنی ہے۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں آپ کو کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کروں گا تو اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ آپ کو یہ پوسٹ چھوڑنی ہوگی۔“ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی ایما کو دیکھا۔  
”جی سر ...“ اس کا انداز ہنوز تھا۔ وہ مایوس سی اٹھنے لگی تھی کہ شاذان کے استفسار نے متوجہ کیا۔  
”آپ نے پوچھا نہیں کہ آپ کو اب کہاں ایڈجسٹ کیا ہے؟“  
”جی سر! آپ خود بتا دیجیے۔“ وہ رُک گئی تھی۔

”کیا آپ کو تھوڑی بہت نرسنگ آتی ہے مس شاہنواز؟“ سوال کے جواب میں سوال تھا۔ وہ میکا کی انداز سے سر ہلا گئی کہ پچھلے چار سالوں میں اس نے بابا کی ایک نرس سے بڑھ کر خدمت کی تھی۔  
”میری گرینی ہارٹ پشٹ ہیں ... ان کی دیکھ بھال، ڈائٹ وغیرہ کا خیال رکھنا۔ گھر سنبھالنا اور دیگر ذمے داریاں ہیں ... کیا آپ یہ سب کرسکیں گی؟ آئی مین میرے گھر جا کر۔“ اُسے بغور دیکھتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔  
جس کا چہرہ متغیر ہوتا گیا۔

”لیکن سر! مجھے آپ کے گھر جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں ملے گی ... یوں بھی میں نے آفس اس لیے جوائن نہیں کیا تھا کہ کسی کے گھر میں ...“

”کیئر ٹیکر کی ملازمت کروں ... یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ ...“

اس کے اٹک اٹک کر بولے گئے جملے کو اس نے روانی اور اعتماد سے پورا کر دیا تھا۔ ایما شاہنواز محض پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

”دیکھیے مس شاہنواز! دُنیا میں انسان دو وجوہات بنا کام کرتا ہے، بعض مرتبہ فنانشل سیکورٹی کے لیے اور کبھی کبھار پرسنل سیکورٹی کے لیے، اینڈ آئی تھنک یو نیڈ بوتھ آف دیم (And I think you need both of them)۔ تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اس پرپوزل پر غور کریں؟“

بات اس نے ایسی کہی تھی کہ وہ چونک گئی۔ بھلا وہ کیسے جانتا ہے کہ اُسے ذات کے تحفظ کی ضرورت ہے؟ تئیر اور استعجاب سے پُر نظریں اٹھا کر اس نے شاذان کو دیکھا جو بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اسے اپنی جانب اس طرح دیکھتا پا کر وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔

”رہ گئی اجازت کی بات تو اس کی آپ فکر نہ کریں ... میں کاغذی کارروائی کرنے کو تیار ہوں۔“

”کاغذی کارروائی مطلب ... میں سمجھی نہیں؟“

اب کے وہ باقاعدہ بوکھلا گئی تھی۔ شاذان حیات علی کے لبوں پر ایک بے اختیار سا تبسم آ رہا تھا۔ ”آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ مس ایما ... آپ کو انوسٹ کہا جائے یا فولش ... میرا خیال ہے تھا جتنے واضح اور کلیئر انداز میں، میں نے آپ سے بات کی آپ سمجھ گئی ہوں گی ... ان فیکٹ میں آپ کو پرپوز کر رہا ہوں ... ایما ... دل یو میری می؟“

میز کی چکنی سطح پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بڑے سادہ اور روز مرہ کے معمول والے لہجے میں بولا تھا، مگر ایما کے اوسان خطا ہونے میں ذرا وقت نہ لگا۔ شدید گھبراہٹ اور حیرت سے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”جج ... جی ...“ آواز گلے میں اٹک گئی تھی۔ حلق الگ سوکھ رہا تھا۔

”لیس مس ایما ... اس میں کوئی حرج تو نہیں ... آپ اچھی ہیں، گڈ لگنگ اینڈ چارمنگ ... کیا میں آپ کو پرپوز نہیں کر سکتا؟“ اب کے وہ نروس کر دینے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

ایما کی سرسئی آنکھیں حیرت سے مزید کشادہ ہوئیں۔ ایک لمحے کو اس نے رُک کر اُسے دیکھا اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ کمرے سے باہر دوڑ لگاتے ہوئے اس نے شاذان کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔

”اسٹوپڈ لڑکی۔“

اس کی یہ حرکت شاذان کا موڈ آف کر گئی۔ آج صبح ہی کرسٹینا نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اپنی چند فرینڈز کے ساتھ فلوریڈا جا رہی ہے گرمیوں کا موسم انجوائے کرنے کے لیے، چونکہ اُسے گرینی کی وجہ سے ابھی یہاں رُکنا تھا۔ لہذا یہ خبر اسے خوش کر گئی جبکہ اگر وہ اس وقت لندن میں ہوتا تو کرسٹینا سے اس بات پر اختلاف ضروری ہو جاتا۔

شاید اسی لیے اس نے اطمینان اور اچھے موڈ میں ایما سے بات کہہ ڈالی تھی مگر اب غصہ آ رہا تھا۔

”یہ سلی گرل کیا خاک گرینی کا خیال کرے گی جس میں کانفڈینس نام کی کوئی چیز نہیں۔“ ذرا دیر بعد ہی



احتشام کے سامنے وہ مشتعل سا کہہ رہا تھا

”تو تمہیں بھی کچھ سمجھ کر بات کرنا چاہیے تھی شاذان۔ یہ پاکستان ہے، انگلینڈ نہیں کہ آپ پرسنی اُسے پروپوز کرنے پہنچ گئے۔“ ساری بات سُن کر احتشام نے اُسے ہی گھورا تھا۔

”تو کیا ابھی سے بارات لے کر جاتا اس کے گھر؟“ وہ اور بھی طیش میں آ گیا۔

”کم ان شاذان ... یہ بے وقوفی ہے ... ایک تو تم نے غلطی کی اور اب بگڑ بھی رہے ہو ... اپنی وے تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، میں کل گرینی اور تمہاری بھابھی کو لے کر جا رہا ہوا یمما شاہنواز کے گھر۔“ اُسے ڈپٹ کر اس نے فیصلہ سنایا تو شاذان چپ ہو رہا۔

”مٹھائی تیار رکھنا کیونکہ جس قسم کی اس کی گارجین ہیں بقول تمہارے، جلد ہی ہاں ہوگی۔“

”بقول میرے نہیں، بقول مس عینی کے۔“

احتشام کے چھیڑنے پر وہ اُسے خشمگین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نصیحت کی۔ جس پر اس نے اثر ہی نہیں لیا۔

یونہی ہنستے ہوئے اُسے چھیڑے گیا۔



گرینی کو مٹھی میں لینا احتشام کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ شاذان خائف ہی رہا کہ شاید گرینی کوئی اعتراض کریں، مگر ایسا نہیں ہوا، چنانچہ تیسرے دن ہی وہ احتشام کی بیوی ثنا کے ساتھ ایما کے گھر چلی گئیں۔

ایما دو دن سے غیر حاضر تھی۔ شاذان کو اندازہ تھا کیوں؟ لہذا جس دن وہ سب اس کی طرف گئے ہوئے تھے۔ وہ باوجود قدرے تفکر کے اطمینان سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ذہن کرسٹینا کے ساتھ مو پرواز تھا۔

جانے وہ کہاں ہوگی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ مجھے یاد بھی کرتی ہوگی یا اپنی دوستوں میں بزی ہوگی؟ سوچ کا دائرہ پھیلتا ہی جا رہا تھا کہ ان سب کی واپسی نے سارا ارتکاز ہی توڑ ڈالا۔

”خیریت کیا رہا؟“

احتشام سب سے پہلے اندر آیا تھا۔ اس نے بھنویں اُچکا کر پوچھا تو وہ اس کے نزدیک چلا آیا ”وہی رہا جس کا مجھے یقین تھا۔ وہ اولڈ وومن اتنے دِل آف لوگوں کو دیکھ کر پہلی ہی فرصت میں ریشہ حطمی ہو گئیں، البتہ ایما بہت نروس ہو رہی تھی۔“ احتشام نے اس سے ریموٹ لیٹے ہوئے بتایا

”آئی سی اور گرینی کو کیسی لگی وہ۔“ اُسے قدرے اطمینان ہو گیا۔

”بہت اچھی لگی مگر ... وہ اس کی کم عمری سے خائف تھیں ... تمہارا اور اس کا ایج ڈفرنس کہیں بعد میں complications پیدا نہ کرے ... اس کا خوف ہے اُنہیں ... کچھ تم دونوں کے مزاج کے تضاد نے بھی اُنہیں تفکر میں ڈال دیا۔“ احتشام نے اب کے چوتھا چینل ٹیون کر لیا تھا۔ شاذان بھنویں اُچکاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ الجھ

کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”کیا مطلب! مزاج کا تضاد کیسا؟“

”بھی تم ٹہرے آتش فشاں مزاج اور وہ بے چاری معصوم سی لڑکی ... تمہاری تو ایک تیز نظر سے پگھل جائے گی وہ ... گرینی چاہتی ہیں کہ تمہاری بیوی ایسی طرح دار ہو جو تمہیں پاکستان میں باندھ کر رکھے جبکہ ایما بہت نازک اور آسانی سے دب جانے والی لڑکی ہے۔“ احتشام نے تفصیل سے تبصرہ کیا تھا جس کے باعث اس کے چہرے پر سختی اُبھر آئی۔

”گرینی کا مسئلہ یہ ہے شامی کہ وہ رشتوں میں بلیو کرتی ہیں۔ جبکہ میں محبت اور سینٹی مینٹس کو اہمیت دیتا ہوں ... ایما شاہنواز میرے لیے فیوچر میں محض ایک رشتہ، ایک تعلق ہوگی جبکہ Christina is my life and my love۔“

گرینی کو ثنا بھابھی کے سہارے اندر آتا دیکھ کر وہ سنجیدگی سے کہتا اُٹھ کھڑا ہوا تھا جبکہ احتشام اپنی جگہ بیٹھا اُسے گہری نظر سے دیکھتا، کچھ سوچتا رہ گیا جو ذرا دیر بعد گرینی اور ثنا بھابھی سے ہنس بول رہا تھا۔ البتہ گرینی کے چہرے پر خوشی اور پسندیدگی کا واضح تاثر دیکھ کر دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

تمام زندگی ہم کسی ایک المیے کو سینے سے لگا کر جی نہیں سکتے کہ زندگی ہمیں اس کا موقع اور مہلت نہیں دیتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان خود کو ڈھال لیتا ہے۔ جیسے ایما نے بابا کے انتقال کے بعد خود کو زندگی کے حوالے کر دیا تھا۔ پھپھو کا ہر حکم تابعداری سے مان لیتی تھی، مگر اب اچانک اس موڑ پر آ کر وہ سہم گئی۔

پھپھو کے لیے محض پیسہ اہم تھا۔ شاذان کیسا ہے؟ کس مزاج، کس طبیعت کا ہے۔ اُنہیں ایسے کسی سوال سے دلچسپی نہ تھی حتیٰ کہ اُنہوں نے ایما سے بھی رضامندی لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ گزرے چند دنوں میں ہی وہ شاذان کا مزاج اور اس کی طبیعت کسی حد تک سمجھ چکی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ جس شخص نے پی اے کی پوسٹ کے لیے اُسے رتبہ جیکٹ کر دیا تھا وہ بیوی کے اہم ترین عہدے پر اُسے کیسے سرفراز کر سکتا ہے۔

”کم آن ایما ... تیری بھولی بھالی صورت پر دل آ گیا ہوگا اُن کا۔“ کئی دن سے وہ خدشوں اور اندیشوں میں الجھی ہوئی تھی۔ عینی نے کہا تو وہ چڑنے لگی۔

”خدا کے لیے عینی بات کو سمجھا کرو ... میری اس بھولی بھالی صورت ہی کو تو اُنہوں نے رد کیا تھا۔“

”تو کیا ہوا ... بعد میں غلطی کا اندازہ ہو گیا ہوگا اسی لیے کفارہ بھی ادا کر دیا۔“ عینی کی تو بن آئی تھی۔

مسلل اُسے زچ کیے دے رہی تھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتی رہی پھر بولی:

”مجھے ایم ڈی صاحب سے بہت خوف آتا ہے عینی ... میرے لیے تو ان کے سامنے چند منٹ رُک کر

ڈکٹیشن لینا مشکل تھا ... میں ساری زندگی کس طرح اُن کے ساتھ گزار سکتی ہوں ... اُن کا مزاج کتنا سخت ہے؟“ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

پھپھو نے اس کا عندیہ تک نہیں لیا، اس کا دکھ الگ تھا۔ اگر بابا یا اس کی والدہ زندہ ہوتیں تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے۔ یہی سوچ کر وہ روہا سی ہوئی جا رہی تھی۔

”مزاج سخت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کا دل بھی سخت ہوگا ... دیکھو ایسا سر نے تمہیں خود پسند کیا ہے ... کوئی تو وجہ ہوگی نا ... اگر تو اُنہیں تم سے محبت ہوگئی ہے جیسے کہ میرا تو صد فیصد یہی خیال ہے تو پھر تمہیں ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ... ارے تم جیسی حسین اور کم عمر بیویاں تو شوہروں کو اُنکلیوں پر نچاتی ہیں۔“

”مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے دُنیا میں اچھی اور پر اعتماد لڑکیوں کی کمی تو نہیں، آخر ایم ڈی صاحب نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا؟ سچ کہوں عینی، میرا دل گھبرا رہا ہے ... کہیں ایسا نہ ہو آگے کنواں دیکھ کر میں پیچھے ہٹوں تو کھائی میں جا گروں۔“

”خدا نہ کرے ... بد فال منہ سے مت نکالو ... ارے اگر یہ کھائی ہے تو میں بھی دس مرتبہ گرنے کو تیار ہوں ... تم بھی اللہ پر بھروسہ رکھو ... حالات بہتر ہی ہوں گے ... بعض لوگ ہوتے ہیں اُنہیں ڈال پر سجا گلاب نہیں کیچڑ میں کھلا کنول پسند آتا ہے ... نظر اپنی اپنی انتخاب اپنا اپنا۔“

عینی کی نیم مزاحیہ بات بڑی بے ساختہ تھی، تاہم وہ محض مسکرا ہی سکی۔

”اب تم یوں کرو کہ اپنے ہونے والے سرتاج کو مٹھی میں کرنے کے سارے گریسیکو ... تمہاری پھپھو کو تو سلام کرنا چاہیے کہ اُنہوں نے پیسے کی لالچ میں سہی کوئی رخنہ پیدا نہیں کیا۔ اب تم جاؤ ”حیات ولا“ اور اُنہیں دے جاؤ یہ ایک سو بیس گز کا مکان ... اچھا ہے ساری زندگی پراپرٹی ٹیکس بھرنے کے لیے محنت مزدوری کریں گی تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔“

عینی نے ہنوز اسی موڈ میں اسے تسلی دی اور پھپھو کے مستقبل کا نقشہ کھینچا تو ایک بار پھر وہ ”اب کیا ہوگا؟ کے بھنور میں جا پھنسی۔



شادی کی تیاریاں اسی روایتی شان سے کی گئیں جیسی کہ حیات ولا کا طرہ امتیاز تھا، تاہم جوں جوں دن قریب آتے جا رہے تھے شاذان کی بے چینی عروج پر تھی۔ ساتھ ہی اس کی مکمل کوشش تھی کہ کسی بھی طرح یہ خبر لندن کرسٹینا تک نہ پہنچے اور اس کے لیے اس نے اپنے تمام ملنے جلنے والوں کو جن کا کرسٹینا سے معمولی سا بھی تعلق رہا ہو، شادی میں مدعو نہیں کیا تھا۔

شنا بھابھی نے گرینی کی حسبِ منشا تیاریاں کی تھیں۔ خوشی ہی تھی کہ گرینی بھی بیماری بھول بھال کر مستعد سی

ہو گئیں۔ شاذان ان کو تیزی سے ری کور ہوتا دیکھ کر کافی مطمئن تھا جبکہ وہ ہمہ وقت اُنہیں ٹوکے جاتا۔  
 ”گرینی پلیز آپ ریٹ کریں، اتنا تھکنا آپ کے لیے ٹھیک نہیں، شاپنگ بھابھی سے کر والیں کیونکہ یہ بہت ٹائرنگ جاب ہے ... آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔“ اس دن بھی وہ گرینی کو بے حد تھکا ہوا آتا دیکھ کر خفگی سے کہہ اُٹھا تھا۔

”لو میں بھلا کہاں تھکی ... دیکھتے نہیں کیسی خوشی کی لالی چھائی ہے میرے چہرے پر ... ارے بیٹا کیا بیماروں کی شکل ایسی ہوتی ہے۔“ گرینی ثنا بھابھی اور ملازموں سے گواہی مانگتے ہوئے بولیں تو سب اُنہی کے ہم نوا ہو گئے۔ تھک کر وہ احتشام کے سر پر جا سوار ہوا۔

”دیکھو شامی یہ سارے ہیڈک میں گرینی کے لیے برداشت کر رہا ہوں، لہذا یہ تمہارا ذمہ ہے کہ وہ بالکل ٹھیک رہیں۔ اُنہیں ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہونا چاہیے ورنہ میں شادی وادی چھوڑ کر لندن چلا جاؤں گا۔“ اس کا ناگواری چھلکاتا لہجہ احتشام کو چونکا دیتا۔

”تو کیا اب تک اس کے دل میں ایما کے لیے کوئی سوٹ کارنر پیدا نہیں ہوا جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ دھیرے دھیرے کرسٹینا سے دور ہوتا چلا جائے گا، مگر لگتا ہے ایسا ہونے میں کچھ وقت لگے گا ... دیکھتے ہیں ایما شاہنواز کہاں تک اس کے دل پر اپنا رنگ جما سکتی ہے۔“



شادی سے تین دن پہلے مہندی کی رسم شاذان نے روک دی تھی لہذا محض نکاح کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقررہ دن گرینی نے ہوٹل کے بال روم میں بھرپور تیاری کروائی تھی۔

پھپھو نے مروتاً بھی خودداری کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس کے باعث احساسِ شرمندگی اور بے بسی سے وہ جیسے بالکل چپ ہو گئی تھی۔ عینی کا دیا ہوا حوصلہ بھی اس کے کسی کام نہیں آ رہا تھا۔ ثنا بھابھی نے بہترین پارلر سے اُسے تیار کروایا تھا، مگر اس کی نظر نہیں اُٹھ رہی تھی کہ خود کو دیکھتی۔ پھپھو کی لالچ سے وہ بخوبی واقف تھی، مگر وہ اس حد تک گر جائیں گی اُسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔ ندامت کے باعث وہ ہونٹ کاٹتی بمشکل خود پر قابو کیے بیٹھی تھی۔ جونہی ثنا اُسے لے کر ہوٹل پہنچی، پھپھو اس سے ملنے چلی آئی تھیں۔

”خدا نظر بد سے بچائے میری بچی کو! کیسا چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔“ باقاعدہ اس کی بلائیں لیتے ہوئے وہ کہہ رہی تھیں۔ ایما کی دکھ سے اُٹھی نگاہیں ان کا چہرہ چھو کر لوٹ آئیں۔

عینی ساتھ ہی کھڑی تھی۔ بے زاری سے اُنہیں دیکھا۔ عجیب سے احساس میں گھرتے ہوئے ایما کی آنکھیں بے ساختہ بھیگ گئی تھیں۔

ذرا دیر بعد سارے مہمان آگئے تو نکاح کی رسم ادا کر دی گئی۔ دل پر نجانے کتنا بوجھ تھا جو آنسوؤں کی صورت

پھوٹ نکلا تھا۔ گرینی نے آکر اُسے بے ساختہ گلے سے لگا لیا۔ ”بس بیٹا! اتنا نہیں روتے والدین کا گھر لاکھ عزیز سہی لیکن سسرال تو جانا ہی ہوتا ہے نا۔“ محبت بھرا لمس اور شفقت بھرا لہجہ اُسے مزید دکھی کیے دے رہا تھا۔

”میرا شاذان لاکھوں میں ایک ہے ... تمہیں بہت خوش رکھے گا، دیکھنا!“ وہ اسے سادگی سے بہلا رہی تھیں۔ آنسوؤں کے بیچ اس کے لبوں پر محبوب سی مسکان اُتر آئی اور یہ شاید گرینی کی محبت کا اثر تھا یا اُن کی قربت کا کہ اس کے آنسو تھم گئے تھے۔ بقیہ وقت وہ اس کے پاس بیٹھی رہی تھیں۔ پھپھو بھی قریب ہی تھیں، مگر اس کا انہیں دیکھنے کو دل تک نہ چاہا۔

”تمہاری ددیا ساس کس قدر محبت والی ہیں ... مجازی خدا کا کیا ہوگا؟“ عینی موقع ملتے ہی سرگوشی کر گئی۔

بالآخر اسے اسٹیج پر لا کر شاذان کے ساتھ بٹھایا گیا جو ساتھ بیٹھے احتشام سے مسلسل مچو گفتگو تھا۔

”گلتا ہے شرما رہے ہیں شاذان صاحب ... ایک نظر بھی نہیں ڈال رہے۔ ویسے اچھا ہی ہے ورنہ نظر ہٹانا محال ہو جاتا ان کے لئے۔“ ثنا بھابی نے نوٹ کر کے فوراً چوٹ کی تھی۔ وہ محض مسکرا دیا۔

”اوہو! الفاظ بھی بچائے جارہے ہیں۔“ اس کے محض مسکرا دینے پر جملہ کسا گیا تھا۔

”ظاہر ہے ایما بھابی کو ”کھتا“ بھی تو سنانی ہوگی۔“

یہ سب شاذان کے دور قریب کے دوست اور شوخ کزنز وغیرہ تھے جو اُسے چھیڑنے کے ساتھ ساتھ دلہن پر بھی تبصرہ کیے جا رہے تھے۔

”واقعی شاذان بہت لکی ہوتم، زبردست مسز ملی ہیں تمہیں۔“ سب کے تعریفی تبصرے کے بعد احتشام نے بھی خلوص سے کہا تھا۔

”اسے کہتے ہیں دیر آید، درست آیا ... ہم نے چوبیس سال کی عمر میں بیڑیاں ڈال لیں اور یہاں چھبیس سال بعد بھی پری مل گئی ... پتہ ہوتا تو ہم بھی انتظار کر لیتے۔“ شاذان کے کسی بذلہ سنخ دوست نے مسرت بھرے انداز میں کہا تو سب ہی ہنس پڑے۔

حتیٰ کہ شاذان بھی مسکرا کر جواباً بولا: ”اسی لیے کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا کام۔“

”ویل سیڈ ... ویل سیڈ۔“ سب متفق تھے۔

اسی ہنسی مذاق میں کھانا سرو ہو گیا۔ اُسے بھی کھلایا گیا، مگر اس سے دولقموں سے زیادہ لیا نہ گیا تھا۔

اس پر جو روپ چڑھا تھا، وہ دیکھنے لائق تھا۔ لائیٹ پنک اور مہرون کلر کے بھاری عروسی گاؤن پر ڈل بروز کلر کانفیس کام بنا ہوا تھا۔ طلائی زیور میں گرینی کا خاندانی جڑاؤ سیٹ سب سے منفرد تھا۔ چھب ایسی تھی کہ نظر نہیں ٹک رہی تھی۔

ایما کا سادہ سراپا آج پہلی بار یوں سج کر دو آتشہ ہو رہا تھا۔ کھانے کے دوران شاذان اُٹھ کر اپنے دوستوں

کے پاس چلا گیا تھا۔ یعنی اور ثنا بھابی اس کے ساتھ تھیں۔ بعد میں مووی کا سلسلہ شروع ہوا تو شاذان کو واپس بلایا گیا۔

”شاذان پلیز آجاؤ اب ... کتنا کھاؤ گے؟ دل نہیں بھرا تمہارا اور یہاں اپنی مسز کو دیکھو جس سے دو لقمے لینے مشکل ہو گئے ہیں۔“ ثنا بھابی اُسے کھینچ لائی تھیں۔

”افوہ بھابی! اب بس بھی کریں یہ ویڈیو کا چکر، میں سخت ارریٹیٹ ہو رہا ہوں۔“ وہ جھنجھلا رہا تھا۔ مروتاً بھی لحاظ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”بکو مت ... زیادہ نخرے مت کرو ... بیٹھو شرافت سے۔“ شانے پکڑ کر یکدم سامنے کیا تو نظر بلا ارادہ سیدھی صوفے پر بیٹھی ایما پر پڑی۔ ایک لمحے کو جیسے دل ڈول سا گیا۔

دھڑکنوں کا راگ ایک لمحے کو تھمتا ہوا محسوس ہوا۔

نظر کی برق رفتاری میں رخنہ پڑا تھا۔ جس سرعت سے نگاہ اٹھی تھی اس تیزی سے پلٹ نہ سکی۔

کہتے ہیں تجھ کو لوگ مسیحا مگر یہاں  
ایک شخص مر گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

”اوہو!“

ہونٹ سیٹی کی صورت وا کرتے ہوئے احتشام نے عقب سے آکر بظاہر ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے اس کے شانے کے اوپر سے سرگوشی کی تھی۔

اس نے گردن موڑ کر غصیلی نظر اس پر ڈالی جس کی عقابی نظریں چہار اطراف گھومتی تھیں۔ احتشام جواباً کچھ اس انداز سے مسکرایا کہ وہ بمشکل لبوں پر پھسلنے والے تبسم کو دبا سکا۔ کچھ دیر اسی طرح کا ہنگامہ رہا حتیٰ کہ گرینی نے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد رخصتی کا حکم جاری کر دیا۔

بہت کٹھن لمحات تھے اس کی آنکھیں بے ساختہ جھلملا گئی تھیں۔

شاذان حیات علی کے احساسات بہت منتشر ہو رہے تھے۔ ایک کشمکش سی چل رہی تھی اندرونِ دل ... وہ اپنی کیفیت خود ہی سمجھنے سے قاصر تھا۔

ثنا بھابی نے گرینی کے کہنے پر تیزی سے رخصتی کا مرحلہ نبٹانا شروع کیا۔ پھپھو نے جس لمحے اُسے گلے لگایا اُسے اپنے سارے دکھ اور غم بھولنے لگے۔ ساری شکایتیں، کلفیتیں اور شکوے کہیں دور جا چھپے۔ بس پچھڑ جانے کے احساس نے اس کی پوری ذات کا حصار کر لیا تھا۔

یعنی کے شانے سے لگ کر تو پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

شاذان ایک عالم بیزاری میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ احتشام نے محسوس کر لیا تھا اس لیے ثنا بھابی کو اشارہ

کیا، جنہوں نے بمشکل اُسے عینی سے علیحدہ کر کے گاڑی میں لا بٹھایا۔ گاڑی چلی اور اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ آئی۔ ایما کے دل کی دھڑکن سست پڑنے لگی تھی، احساسِ جدائی حاوی ہونے لگا تھا۔

پھپھوگو اس سے محبت نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کے تشدد کے نشان تو آج بھی اس کی روح اور دل پر تھے ... جسمانی زخم گو کہ بھر چکے تھے مگر پھر بھی وہ اس کے میکے کا مان تھیں۔ بابا کی بہن ہونے کے ناطے ان سے محبت تھی۔ لیکن اب وہ سب کو چھوڑ آئی تھی۔ ایک نئی زندگی کا سفر کرتے ہوئے شاذان کی سنگت میں بھی خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ بابا اور اماں کی بے شمار یادوں نے اُسے رلا رلا دیا۔ اس کی واحد دوست عینی اور اس کے بچپن کی یادیں سب پیچھے رہ گئی تھی۔ بے اختیار اس کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ ثنا بھابھی اس کے ساتھ بیٹھی شاذان سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں جو ایما کی داہنی جانب کافی ریلیکس بیٹھا تھا۔ آج سر سے ایک بوجھ ٹلا تھا جیسے ... گرینی آگے بیٹھی تھیں۔

”بہت نازک ہے تمہاری وائف شاذان ... اس کا بہت خیال رکھنا۔“ ثنا نے اس کے آنسو دیکھ لیے تھے۔

آہستگی سے اُسے اپنے شانے سے لگا لیا۔

”ڈونٹ وری مسز ... میرا دوست بھی آئرن مین ہے ... اپنی چیز کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے۔“ احتشام نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی تھی۔ گرینی مسکرانے لگیں۔

”ہاں مگر حفاظت ہی کریں کہیں اس کانچ کی گڑیا کو اپنے آئرن وجود سے گزند نہ پہنچائیں۔“

ثنا نے ہنستے ہوئے خدشے کا اظہار کیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ایما نے سہم کر بے ساختہ ثنا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

جبکہ شاذان محض مسکرا رہا تھا۔

”لو جی ... تم تو ابھی سے ٹھنڈی پڑ گئی ہو ... ارے شاذان حیات علی کی مسز بنی ہو، دل گردہ مضبوط کرلو ... یہ ہمارے دیور جی کسی جنرل کرنل سے کم نہیں۔“

ثنا کو ایک اور موقع ملا چھیڑنے کا۔ کن اکھیوں سے شاذان کو دیکھا تو وہ مصنوعی ناراضگی دکھائے ہوئے بولا۔

”دس از موسٹ ان فیئر بھابھی ... آپ میری وائف کو ڈرا رہی ہیں۔ جبکہ آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیے اس وقت میری تعریفیں کرنی چاہئیں۔“

ثنا اس کی مسلسل خاموشی کو توڑنے کی کوشش میں تھی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی نہ کرسٹینا سے متعلق نہ شاذان حیات علی کے دل سے متعلق سو ان پر اور گرینی پر وہ کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو بڑی مشکل سے بولا۔ اب تک وہ اس ”ایکٹنگ“ کا عادی نہیں ہو سکا تھا۔ ایما کے لیے یہ لہجہ، یہ مسکراتا چہرہ اور یہ انداز سب اجنبی تھے۔ حیرت سے اس کے آنسو پلکوں پر ہی ٹھنک گئے۔ دل میں قدرے اطمینان اُترا۔

”نہ بابا نہ، مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں۔“

ثنا نے برجستگی سے جواب دیا تھا ذرا دیر کے لیے کار کی فضا قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

”بول دو جھوٹ مسز ... تھوڑی بہت ہیرا پھیری تو جائز ہے، کیوں گرینی!“ احتشام ہنسی روک کر بولا تو گرینی بے اختیار ہنس دیں۔

”میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میرا شاذان اگر ہزاروں میں ایک ہے تو ایما لاکھوں میں ایک ... یہی سچ ہے باقی سب جھوٹ۔“

گرینی کی پر شفقت آواز اور محبت بھرے لہجے پر ایما کے بے چین دل کو شدید راحت محسوس ہوئی۔ اس نئے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے اُسے یہ احساس ہو چلا تھا کہ یہاں سب اُسے چاہتے ہیں اور یہ احساس گزرے دنوں میں پامالی کی اذیت بھری یادوں کو بھلانے میں بے حد معاون ثابت ہوا تھا۔

”سن لو شاذان ... ابھی سے تمہاری ویلیو گھٹ گئی ہے۔“ ثنا بھابھی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی گرینی کی بات پر۔  
”اٹس نیور مائنڈ بھابھی ... میں جانتا ہوں گرینی کو دل رکھنے کی عادت ہے۔“

اس طرف اطمینان کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایسے ہی ہنسی مذاق کرتے کرتے وہ حیات ولا پہنچ گئے جہاں اس کے استقبال کے لیے گرینی نے خاص انتظامات کرا رکھے تھے۔

روشنی اور نور کے ققموں سے جگمگاتا حیات ولا سیاہ آسمان پر سفید چاند کی مانند نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی، خوشی ہی خوشی تھی۔

صبح ایما کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک پر کھلی۔ وال کلاک کی طرف نظر گئی، صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

اتنی دیر تو وہ کبھی نہیں سوئی تھی، مگر پچھلی کئی راتوں کی نیند نے اُسے آج غافل کر دیا۔ دستک ہونی بند ہو چکی تھی۔ غالباً اس کی طلائی چوڑیوں کی کھنکھناٹ باہر پہنچ گئی تھی۔ سامنے قد آدم آئینے پر نظر پڑی تو وہ خود کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ کل کی طرح آج بھی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی، مگر آج اس کے اندر کی خوشی چہرے پر پھوٹ آئی تھی۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس نے دیکھا۔ شاذان حیات علی اپنا بازو آنکھوں پر رکھے بہت اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کی نظر ٹھہر سی گئی۔

پچھلے چند ماہ میں اُس نے کبھی اُسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار یہ جسارت کر رہی تھی۔ پہلے کبھی اس کے غصے نے ہمت ہی نہ کرنے دی تھی۔

اسی اثنا میں دوبارہ دستک ہوئی تو وہ دوپٹے سر پر ڈال کر دروازے تک چلی گئی۔ سامنے ہی ثنا بھابھی کھڑی تھیں۔

”ایما تمہاری پھپھو اور عینی وغیرہ اکٹھے آئے ہیں ناشتہ لے کر ... شاذان اور تم نیچے آ جاؤ ... مگر ذرا جلدی کرنا۔“ ثنا کہہ کر رُکے بغیر چلی گئیں تو وہ اندر لوٹ آئی۔



شاذان ہنوز سو رہا تھا۔ اُسے اُٹھانا بھی ایک مرحلہ لگا۔ بالآخر ہمت تو کرنا ہی تھی۔ اس کا بازو دھیرے سے چھو کر اُسے جگانے کی کوشش کی۔

”اُٹھ جائیے ... سر ...!“

مخاطب کرنے کے لیے کچھ اور نہ ملا تو سر ہی کہہ گئی۔ شاذان نے کافی دیر کی جدوجہد کے بعد آنکھیں کھولیں تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا بات ہے اتنی جلدی کیوں جگایا ہے؟“ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے وہ سخت ناگواری سے بولا تھا۔ ایما کا دل دوبارہ سہم گیا۔

”وہ ... بھابھی آئی تھیں۔“ گھبرا کر وضاحت کر رہی تھی کہ احتشام نے باہر سے پکارا تھا۔

”شاذان اُٹھ کر شرافت سے باہر آجاؤ ... تمہارے مہمان تک جاگ گئے ہیں۔“

ایما اُسے جھنجھلا دیکھ کر تیزی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کافی دیر بعد باہر نکلی تو شاذان وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

اس دوران شاذان کے سیل فون کی بیل بجی۔ ایما نے مڑ کر واش روم کے دروازے کی طرف دیکھا مگر شاذان ابھی باہر نہیں نکلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کال سننے یا نہ سننے۔ اتنے میں بیل بجنا بند ہوگئی تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بالوں کو کچر میں قید کیا اور ابھی پرفیوم اٹھا کر لگانے لگی ہی تھی کہ فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ اس بار بیل لگاتار بجے چلے گئی۔ یوں لگتا تھا کہ فون کرنے والا بے تاب ہے۔ بیل اسی طرح بجتی رہی تو اسے ناچار فون ریسیو کرنا پڑا۔

”ہیلو۔“

”Where is Shazan- (شاذان کہاں ہے؟)۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز اور انگریزی لہجہ سن کر وہ ٹھٹھک گئی۔ ”give him the phone (اسے فون دو)۔“ اس کے یوں خاموش ہو جانے پر باقاعدہ ڈپٹ کر کہا گیا تھا۔

”کون ہے ایما؟“ اس دوران شاذان باہر نکل آیا تھا اسے سیل فون ہاتھ میں تھا مگر صم دیکھ کر پوچھا۔

”پتا نہیں سر۔ آپ کو پوچھ رہی ہیں۔“

دوسری طرف جس استحقاق سے کہا گیا تھا وہ نروس ہوگئی تھی۔ شاذان خطرے کی گھنٹی محسوس کرتا تیزی سے آگے آیا تو اسے فون تھا کر اسے دیکھنے لگی۔

”Hello Chistina, is it you?“ (کرسٹینا کیا یہ تم ہو؟)۔ شاذان کے لہجے میں بے تابی تھی۔ اس نے جس

انداز سے کرسٹینا کو پکارا تھا اس سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دونوں کے درمیان باہم آشنائی ہے۔ ایما کے لب آپس

میں بھیج گئے۔

شاذان نے اسے ایک نظر دیکھا اور کمرے سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ دل پہ بوجھ لیے باہر نکل گئی۔ احساسات کی نازک دنیا تین لفظوں سے استوار ہو چکی تھی۔ ایک دن ہی اس کے اندر بہت بڑا تغیر لائی تھی۔ شاذان اس کا شوہر تھا۔ اگر وہ اس کی تھی تو وہ بھی تو اس کا تھا۔ پھر بیچ میں یہ کرسٹینا کون تھی۔

شاذان نے اسے باہر جانے کو کیوں کہا؟

وہ باہر چلی تو گئی مگر دل اندر چھوڑ گئی تھی۔ شاذان نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ دوسری طرف کرسٹینا پوری گرج چمک کے ساتھ برس رہی تھی کہ پچھلے ایک مہینے میں اس نے اُسے بالکل کال نہیں کیا تھا۔ اکثر اس کا سیل بھی بند ملتا تھا۔ شاذان اس کی شکایتوں کے جواب میں نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

”Who is this girl, is she your servant? (یہ لڑکی کون ہے، کیا وہ تمہاری نوکرانی ہے؟)۔“

شاذان کے بہانوں کے جواب میں کرسٹینا نے ہنوز کرخٹ لہجے میں رعونت سے پوچھا تو وہ ”سروٹ“ کے لفظ پر اٹک سا گیا۔

”تمہیں یہ پوچھنا نہیں چاہیے ... مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے کرسٹی۔“ وہ سنبھل کر محبت بھرے لہجے میں بولا تو کرسٹینا چپ سی ہو گئی پھر کافی دیر وہ اُسے سمجھاتا رہا اور وہ اسی ہفتے واپس آنے پر زور دیتی رہی۔ بالآخر معاملہ دس دن پر ٹلا۔

”But ten days means only ten days, not a single hour more ...“ (دس دن کا مطلب دس دن ہوتا ہے۔ ایک گھنٹہ بھی زیادہ نہیں)۔“

بحث و تمحیص کے بعد اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کیا تو شاذان سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کرسٹینا کی آواز نے اُسے واپس ماضی میں پہنچا دیا تھا۔ اس کی محبت عود آئی۔ کل رات والے احساسات اب قطعاً بدل گئے تھے۔

جس لمحے وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو سب لوگ منتظر تھے۔ ”بہت راہ دکھائی بیٹا ... سب ٹھیک تو ہے۔“ پھپھو بناوٹی محبت کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ گرینی کا خیال کر کے محض سر سے اشارہ کر کے ٹیبل پر آ بیٹھا۔ نظر اٹھا کر ساتھ بیٹھی ایما کو نہ دیکھا جو اس وقت بہت مضطرب نظر آ رہی تھی۔

یعنی اور بھابھی کی چھیڑ چھاڑ میں احتشام سمیت شاذان کی دوسری کزنز بھی شامل تھیں۔ ایما کی نظریں جھکی ہوئی تھیں جبکہ وہ محض ایک آدھ بار سنجیدہ چہرے پر پھیکی مسکراہٹ سجا کر اٹھ گیا۔

احتشام نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ الجھا ہوا ہے ناشتے کے بعد پھپھو اور عینی وغیرہ ایما کے ساتھ جا بیٹھیں تو وہ احتشام کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

”خیریت، یہ چہرے پر بارہ کس خوشی میں بج رہے ہیں ... ناشتے کے لیے ٹیبل پر آنے سے پہلے تو تم اچھے خاصے تھے ... اچانک کیا ہو گیا؟“ بیٹھے ہی تفتیش کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ شاذان گہری سوچ میں غرق خاموشی سے سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے برخوردار۔“

”پلیز شامی۔ مذاق کا موڈ نہیں ہے میرا۔ میں بہت پریشان ہوں اس وقت۔“

”آئی ایم ٹو سیریس شاذان ... بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔“

احتشام حد درجے سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ایما کو اس نے خود پُتا تھا۔ اب لاشعوری طور پر اس کی خوشیوں کی حفاظت اُسے اپنی ذمہ داری لگنے لگی تھی۔

”کچھ خاص نہیں، بس مجھے واپس لندن جانا ہے اور وہ بھی اسی ہفتے میں۔“

وہ بے حد اکھڑا ہوا ہو رہا تھا۔ احتشام کی بھنویں تن سی گئیں۔ اس نے سوال کیا ”کیا کرسٹینا سے بات ہوئی ہے؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے شامی ... وہ مجھے کانٹیکٹ کرے یا نہ کرے مجھے واپس تو جانا ہی ہے نا۔“

”تم واپس ہی تو آئے تھے شاذان ... مائنڈ یو ... تم یہاں سے گئے تھے تو واپسی کا سفر تو اس طرف کرنا ہوگا

نا۔“ احتشام اب بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شاذان تلملا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز مجھے لفظوں میں مت الجھاؤ ... کرسٹینا کو میری ضرورت ہے ... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ میرے

بغیر اکیلی ہو گئی ہے ... شی از مائی وائف شامی اور وہ ...“

”پلیز شاذان ... کم ٹو دا پوائنٹ ... حقیقت یہ ہے کہ تمہیں اس کے اکیلے پن کا خوف نہیں بلکہ اس بات

کا ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر اپنی گزشتہ بلکہ سابقہ زندگی کی راہوں میں نہ کھو جائے۔“ اس کی بات قطع کرتے ہوئے احتشام نے جل کر کہا۔ وہ سرتا پیر جھلس گیا۔

”اٹس انف شامی ... میں مزید کچھ سُنا نہیں چاہتا ... بس اتنا بتاؤ کہ اب گرینی کی فزیکل کنڈیشن کیسی ہے؟

کیا میں ایما کی کسٹڈی میں اُنہیں چھوڑ جا سکتا ہوں؟“ ہاتھ اُٹھا کر اس نے اپنے آہنی لہجے میں قطعیت سے کہا تو احتشام کے لیے سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ اب وہ کچھ اور نہیں سُنے گا۔

”چھوڑ کر تو تمہیں جانا ہے تو پھر یہ سوال تو بے معنی ہی ہے ... یوں بھی ایما میری Judgement کے مطابق

ایک اچھی لڑکی ہے، ہمدرد اور رشتوں کا لحاظ کرنے والی۔“ احتشام کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا۔

شاذان نے قصداً تاثر نہیں دیا۔ ”جب وہ اپنی لالچی پھپھو کی خدمت کر سکتی ہے تو گرینی تو پھر اُسے عزت

اور محبت دیتی ہیں ... مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں کرے گی۔“

”مجھے ...“ پر بالخصوص زور دیا گیا تھا۔ شاذان کچھ نرم سا پڑ گیا۔

”اِس جسٹ چیئنگ شامی ... تم نے مجھ سے خود کہا تھا کہ ایسا جیسی مڈل کلاس لڑکی سے شادی کر کے میری آزادی قائم رہے گی ... مگر وہ میری ذمہ داری ہوگی ... ایسی کوئی کمٹمنٹ نہیں ہوئی تھی میرے تمہارے درمیان ... میں نے محض اُسے گرینی کی خاطر اپنایا ہے۔“

”اور گرینی ...؟ اُنہیں تم کیا جواب دو گے بلکہ خود اپنے دل کو کیا جواب دو گے ...؟ ضمیر کو کیسے سمجھاؤ گے کہ ایک عدد معصوم لڑکی کی زندگی کو تم نے کس آسانی سے تباہ کر دیا؟“

احتشام چیخ گیا تھا بُری طرح جس پر شاذان سخت مشتعل ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

”آئی سی ... اب میں سمجھا تم نے مجھے ٹریپ کیا ہے؟ رشتوں کی نازک ڈوریوں میں الجھا کر یہاں قید کرنا چاہا۔ But you are absolutly wrong۔ مسٹر احتشام کوئی مجھے Compel نہیں کر سکتا ... یہ جو تین بولوں کا رشتہ تم نے استوار کیا ہے نا، اسے میں تین لفظوں سے توڑ بھی سکتا ہوں ... تم نے میرا نام ایما سے جوڑا ہے، میرا دل نہیں۔“

”زہریلے سفاک لہجے میں کہتا وہ تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا تو جیسے لمحے بھر کے لیے اس کا گرم خون گردش کرتے ہوئے تھم سا گیا۔

سامنے ہی ایما کھڑی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ کچھ اس طرح تھام رکھی تھی جیسے ابھی گر پڑے گی۔ اس کی چمکدار آنکھوں کے ستارے بچھ چکے تھے۔ آنسو بنا آواز کے اس کے گالوں پر پھسلے جا رہے تھے۔ شدید شاک نے اُسے ساکت کر دیا تھا۔ شاکی نظریں اس پر جمی تھیں جو لمحے بھر کے لیے صاف ہوئی اور پھر دھندلاتی چلی گئیں۔

”ایما ...“

اس کے لب بے آواز جنبش کر گئے تھے اور وہ جو کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت تھی، کسی بھیانک خواب سے جاگی۔ ایسا جان لیوا انکشاف ہوا تھا کہ ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی سسکی روکی تھی۔ پھر پلٹ کر وہ دائیں جانب بنی اسٹڈی روم کی طرف دوڑی تو شاذان حیات چاہتے ہوئے بھی اُسے روک نہ سکا۔

ایک سکتے اس منظر پہ اس کے اندر بھی ٹوٹا تھا۔

”کیا ہوا؟“ احتشام اُسے یوں دروازے میں ایستادہ و منجمد دیکھ کر بے ساختہ آگے بڑھا۔

شاذان کے اندر اس سوال پر کھلبلی سی مچ گئی۔ باوجود لاکھ خود مختار، خود سر اور کسی حد تک خود غرض ہونے کے وہ احتشام کے سامنے جواب دہ ہونے سے خائف ہو گیا، خود کو سنبھال کر مڑا۔

”تھنگ ... خدیجہ آنٹی تھیں۔“

”دیکھو شاذان ... خیال رکھو ... یہ معاملہ اس طرح طیش کھانے کا نہیں ... تم نے گرینی کی خاطر اتنا سب برداشت کیا ہے تو اب اس کی پرواہ بھی کرو ... تماشہ مت بناؤ چلو چل کر اندر بیٹھو اور اکیلے میں سوچو۔ خود ہی کوئی نہ

کوئی حل نکل آئے گا۔“ اس وقت معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے احتشام کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔ یوں بھی شاذان اس کا سب سے قریبی دوست تھا۔ اس کی پریشانی وہ اپنے دل میں محسوس کر سکتا تھا۔

اور اس وقت اُسے احساس تھا کہ وہ سخت اپ سیٹ ہے۔ اس لیے آرام کرنے کی ہدایت دیتا یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ”انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔“

مگر کیا انصاف کرنا اتنا ہی آسان تھا؟ ایما کا پورا وجود مجسم آنسو بنا اس سے استفسار کر رہا تھا۔  
”کیوں کیا ایسا؟ کیا قصور تھا میرا؟“

”محض یہ کہ میرے سر پہ والدین کا سایہ نہیں... یا اس لیے کہ میں معاشی و اقتصادی طور پر کمزور ہوں۔“  
وہ ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ تصور میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ دوسری طرف وہ جو دروازہ سامنے نظر آیا اسے دھکیلتی دھونکی کی طرح چلتی سانس کو بمشکل قابو کرتی اندر بڑھتی چلی گئی۔

بہت آرام دہ گدلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سر میز سے ٹکا دیا تھا، مگر پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کانٹوں کے بستر پہ دھکیل دیا گیا ہو۔ پورا وجود زخمی محسوس ہو رہا تھا۔ آنسو اُبل اُبل کر گر رہے تھے۔ کل تک وہ کتنی خوش تھی اپنی زندگی اور تقدیر سے رہنے والی ہر شکایت ختم ہو گئی مگر ابھی تو اُسے مکمل طور پر اپنی خوش بختی کا یقین بھی نہیں آیا تھا۔ ابھی تو اس نے خدائے بزرگ و برتر کا شکر بھی ادا نہیں کیا تھا۔ ابھی تو خواب پوری طرح آنکھوں میں سجے بھی نہ تھے کہ اُجڑ گئے۔

سارے ارمان کا نچ کی کرچیوں کی صورت بکھر گئے تھے۔

ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو وہ عینی کے شوخ جملوں کے جواب میں مسکرا کر آئی تھی کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔

کرستینا کے فون اور اس کے لہجے پر وہ ٹھکی ضرور تھی، مگر بات اتنی سنگین ہوگی اس کا قطعاً اندازہ نہ تھا۔ اپنی سماعتوں پہ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا، مگر پھر بھی اشک رواں تھے۔ نجانے کتنی دیر اس طرح گزر گئی تھی کہ اچانک دروازہ کھول کر ثنا بھا بھی اندر چلی آئیں۔

”ایما! ارے کیا ہو گیا بھئی... خیریت تو ہے؟“

اُسے دیکھ کر وہ آگے بڑھیں تو انداز ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ بہ عجلت اس کے قریب آئی ”ایما... ارے کیا بات ہو گئی... ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں... کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟“ وہ اس کا سر اٹھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔  
اپنا غم بھول کر وہ سٹپٹا سی گئی۔ اُسے ثنا سے کچھ کہنا چاہیے یا نہیں۔ یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی اس لیے گھبرا کا آنسو صاف کرنے لگی۔

”ایما، ابھی کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں... کیا پتا ثنا بھا بھی خود بے خبر ہوں۔“ اس کے دل نے

صلاح دی جس پر وہ صائب تھی۔

”نہیں بھابھی! بس ویسے ہی بابا اور اماں کا خیال آگیا تھا۔“ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ایک بار پھر جھللا گئیں۔ ثنا کا دل پسچ گیا۔

”یہ تو نیچرل سی بات ہے ... آج کے دن میکے والے ناشتہ لاتے ہیں اس لیے تمہیں زیادہ خیال آگیا، مگر دیکھو اگر وہ آج کے دن یہاں ہوتے تو تمہیں اس طرح رونے سے دکھ تو ختم نہیں ہوگا ... پھر کیا ہم سب تمہارے نہیں ... گرینی تو بے حد پیار کرنے والی ہیں۔ تمہیں اپنے پینٹس کی کمی محسوس نہ ہوگی۔ یہ میری گارنٹی ہے۔“ وہ اسے بہلا رہی تھیں۔ وہ بجھے دل سے مسکرا دی۔

”دیش لائک آگڈ گرل ... چلو چل کر اپنے کمرے میں آرام کرو ... رو رو کر حشر کر لیا ہے اپنا ... اتنی محنت سے میں نے تیار کیا تھا تمہیں ... خیر بری تو اب بھی نہیں لگ رہی ہو ... شاذان کتنا خوش قسمت ہے کہ تم جیسی پیاری سی نازک سی وائف ملی ہے اُسے۔“ وہ برملا اس کی تعریف کر رہی تھیں۔

اسے ایسا لگا جیسے ثنا کا جملہ کسی انی کی مانند اس کے دل میں اُتر گیا ہو۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں، مگر ثنا نے اُسے موقع نہیں دیا مزید سوچنے کا اور اُسے کھینچ کھانچ کر اس کے کمرے کی طرف لے آئیں۔

”پلیز بھابھی ... آپ مجھے گرینی کے پاس لے چلیں ... میں ان کے پاس جانا چاہ رہی ہوں۔“ اس کا دل مطلق شاذان کا سامنا کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بے بسی سے بولی۔

”اور وہاں جو تمہارے مجازی خدا میری شان میں قصیدہ پڑھ رہے ہوں گے کہ میں نے تمہیں روک رکھا ہے، اس کا کیا ہوگا؟“ ثنا معنی خیزی سے مسکرائیں۔ جواباً وہ بے دلی سے سر جھکا گئی۔

”پلیز بھابھی ... مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”یہی تو دن ہیں گھبراہٹ دور کرنے کے ... چلو شاباش گرینی نے تمہیں اوپر بھجوا دیا تھا، اب ان کے پاس جاؤ گی تو کیا کہو گی؟ یہ کہ آپ کے پوتے سے ڈر لگتا ہے مجھے۔“ وہ ہنس رہی تھی جبکہ اس کی جان پر بنی تھی۔

پھر لاکھ چاہنے پر بھی وہ بھابھی سے بحث نہ کر سکی۔ نہ جانے وہ کیا سمجھتیں سو چپ چاپ ان کے ساتھ مرے مرے قدموں سے چلی آئی۔

”لو جی تمہاری امانت ...“ کمرے میں داخل ہوتے ہی ثنا نے با آواز بلند کہا تو شاذان چونکا اس کی طرف نظر اٹھی تو اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

چہرے پر رونے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ قدرے تفکر سے ثنا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا استفسار سمجھ گئی تھیں۔ مسکرا کر بولیں:

”آج کا دن ہی ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کے اگر پرنس ہوں تو بھی اُن کی کمی وہ فیل کرتی ہے نہ ہوں تو بھی ... بس ذرا اپنے بابا کو یاد کر رہی تھیں تمہاری مسز ... دیکھو تو کیا حال کر ڈالا ہے اپنا۔“ وہ اُسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولیں تو وہ مزید سر جھکا گئی جبکہ شاذان نے ممنونیت سے اُسے دیکھا تھا۔

”اب سنبھالو اسے ... حیرت ہے تمہارے ہوتے ہوئے بھی اسے آج رونے کی فرصت مل گئی ... کیسے شوہر ہو تم، بیوی کی اتنی بھی پرواہ نہیں ... نہ جانے کب سے یہ اسٹڈی میں بیٹھی تھی۔“ دروازے کی طرف جاتے ہوئے ثنا نے دبے دبے لہجے میں اُسے ڈپٹا تو وہ بالوں پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ثنا چلی گئیں تو وہ مڑا۔ بیڈ خالی پڑا تھا۔ وہ ڈرینگ روم میں جا چکی تھی۔ واپس آئی تو کپڑے تبدیل ہو چکے تھے۔ سفید خوبصورت کرتے اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ لال رنگ کی چمڑی تھی۔ زیور اور میک اپ سے مبرا چہرہ ضبط گریہ کی گواہی دے رہا تھا۔

شاذان سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اسے دیکھنے لگا جو خاموشی سے جا کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ یوں ہی کچھ دیر خاموشی ان کے درمیان بولتی رہی۔

شاذان کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے وہ جزبز ہو رہی تھی، مگر سر جھکائے رہی۔ بالآخر اس نے ہی پکارا ”ایما ...“ لہجے میں نرمی تھی۔

”جی سر؟“ سر اٹھا کر ایک نظر اس پر ڈال لی تھی۔ ایسی زخمی نگاہ کہ شاذان حیات علی کا مونگے کی چٹان ایسا دل محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”تم میری بیوی ہو۔ you can call me shazan۔“ وہ اپنائیت سے بولا تو وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔ ”پلیز یہاں آؤ ...“ چند لمحے اس کے کچھ کہنے کا انتظار کرنے کے بعد شاذان نے پکارا تو اُسے بادلِ نخواستہ اٹھنا ہی پڑا۔ انداز خاصہ میکاکی تھا۔ اس کے نزدیک آ کر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ شاذان نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو سامنے پڑی کرسی پر وہ تھکے تھکے انداز میں ٹک گئی۔

”دیکھو ایما ... جو کچھ سنا جائے، ضروری نہیں کہ حقیقت ہی ہو۔“ اس کا جملہ ایسا تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ ویسی ہی ساحرانہ آنکھیں تھیں اور ویسا ہی اس کا زخمی فسوں۔

”آئی مین یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں اپنی لائف میں شامل احتشام کے کہنے سے کیا تھا ... یہ بھی سچ ہے کہ میں گرینی کی فل ٹائم کیئر کے لیے کسی responsible بندے کو یہاں چھوڑنا چاہتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ کرسٹینا میری فرسٹ وائف ہے اینڈ آئی ریڈی لو ہر ویری مچ۔“ شاذان صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔ اس نے ہونٹ یوں کاٹے کہ خون چھلک آیا۔

”مگر یہ بھی سچ ہے That I do trust you اور میں تمہاری رسپیٹ کرتا ہوں ... تم میری وائف ہو ... اس گھر کی ہر چیز پر تمہارا حق ہے اور یہ حق میں نے تمہیں دیا ہے۔ You deserve it۔“ آگے جھک کر اس کا

ہاتھ تھام لیا تھا اس نے۔ وہ جانے کیا سوچ کر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ شاذان نے اُسے نرمی سے مخاطب کیا۔  
 ”گرینی بہت محبت کرنے والی عورت ہیں ... انہیں بغیر رشتے کے بھی محبت بانٹنے کی عادت ہے ... جیسے شامی He is just my friend ... مگر گرینی اُسے میری طرح ہی چاہتی ہیں جبکہ تمہیں تو انہوں نے خود منتخب کیا ہے ... وہ تم سے محبت کرتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تم بھی انہیں ایسا ہی ریٹرن دو گی، کیونکہ تم محبت کرنے اور محبت کروانے کے لائق ہو۔“ وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔

ایما کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو مچلنے لگے، مگر اُسے خود پر ضبط کرنا تھا۔ اس نے کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔ شاید یہی اس کا مقدر تھا کہ رشتے اُسے صلیب کی مانند کندھوں پر اٹھانے تھے۔ اس کی مجبوریوں کے عوض شاذان حیات نے اُسے نکاح کے بندھن کی قیمت چکا کر خریدا تھا۔ اُسے یہ قرضہ اُتارنا تھا۔  
 شام کو ولیمہ تھا۔ ثنا اُسے تیار کرانے کے لیے پارلر لے جا رہی تھیں۔ وہ زخمی روح کی طرح کرچیاں سمیٹتی ان کے کہنے پر عمل کیے جا رہی تھی مگر ذہن ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب کل کی طرح اُسے خوبصورت کا مدار لباس اور حسین زیورات سے سنوارا گیا تو وہ بخار سے بری طرح تپ رہی تھی۔  
 آج بھی ہوٹل میں ریسپشن تھا۔ اُسے شاذان کے ساتھ لا کر بٹھایا گیا تو وہ بھی چونک گیا۔ بے اختیار اس کی چوڑیوں سے سچی کلائی تھام کر بولا۔

”شی از ناٹ ویل ... اسے تو ٹمپر پچر ہے بھابھی۔“  
 ”ہاں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اسے ... شاید نظر لگ گئی ہے ... ماشاء اللہ لگ بھی تو اتنی اچھی رہی ہے۔“ وہ پریشانی سے کہتے کہتے مسکرا دی تھی۔

شاذان کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں کھینچ گئیں۔ جھک کر اُسے دیکھا۔  
 چہرہ بخار کی شدت سے گلابی ہو رہا تھا اور آنکھیں بار بار پانی سے بھر رہی تھیں، جنہیں وہ جھپک جھپک کر اندر اُتارنے کی کوشش کر رہی تھی، پھر اس کے اس میں ایک تحریر واضح لکھی نظر آ رہی تھی کہ (نظر تو میری خوشیوں کو لگ گئی ہے)

”میرا خیال ہے انہیں اندر لے جائیں بھابھی ... یہاں یہ ان ایزی رہیں گی۔“ کچھ سوچ کر شاذان نے بے حد تلخی سے کہا تھا۔ ایما نے بے ساختہ شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، مگر اُدھر اثر نہ ہوا۔  
 ”ارے دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا! اتنی جلدی کیسے اندر لے جاؤں؟ چلو تم چپ بیٹھو ... میں نے دوا دی ہے اسے ... تھوڑا سا برداشت کر لے گی یہ ... نہیں تو گرینی کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔“ ثنا نے ڈپٹ دیا تو دونوں ہی سیدھے ہو بیٹھے۔

پھر بقیہ وقت وہ خود پر کافی ضبط کیے بیٹھی رہی۔ بعد میں ثنا اُسے اُٹھا کر ڈرینگ روم لے گئی جہاں جاتے



ہی اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے تھے۔ اگلے دو دن بخار اور اس کی کمزوری میں نکل گئے۔ شاذان البتہ اس دن کے بعد سے بہت سنجیدگی سے سوچ میں ڈوبا رہنے لگا تھا۔

ٹھیک سات دن بعد اُسے جانا تھا اور یہاں ایما کی حالت کے پیش نظر اُسے گرینی سے اجازت ملتی نظر نہیں آ رہی تھی کہ اچانک لندن سے آنے والے فون نے اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی۔ کرسٹینا کا بڑا خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ اسپتال میں تھی۔

جس وقت یہ فون آیا۔ رات کے چار بج رہے تھے۔ ایما دوا کھا کر سو رہی تھی، مگر بیل بجنے پر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ شاذان نے فون سُن کر جس بے قراری سے بند کیا وہ بھی اُٹھ بیٹھی۔

”خیریت تو ہے؟“ اس کی سوالیہ نظروں میں نیند کا خمار تھا۔

”نہیں، کرسٹینا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ مختصر اور انتہائی فکر مند لہجے میں کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور فلائیٹ بک کرانے لگا۔ وہ سبھی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتی بیڈ کراؤن سے لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی صبح سات بجے کی فلائیٹ کی سیٹ ملی تو وہ بہ عجلت اُٹھ کھڑا ہوا۔

”میرا سوٹ کیس سیٹ کرو، میں آتا ہوں۔“ تیزی سے باہر کی جانب جاتے ہوئے اسے ہدایت دی گئی تھی۔ اس کے اندر اس ناگہانی پر جیسے برسوں کی تھکن اُتر آئی تھی۔ وہ شاذان کی بیوی تھی۔ وہ بھی نئی نویلی ... ابھی ان کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

مگر شاذان کرسٹینا کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ چند دنوں میں اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ نیند کا بے حد رسیا تھا۔ سوتا تو گھنٹوں کی خبر لاتا، مگر اس وقت وہ اپنی نیند بلائے ہوئے تھا۔

بہت سی سوچوں نے اس کی آنکھیں دھندلا دیں تھیں، مگر وہ سر جھٹک کر اُٹھ گئی۔ سوٹ کیس تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سامنے ہی پڑا تھا۔ اس نے ضروری سامان رکھنا شروع کیا۔

”ہری اپ ایما! اتنا ٹائم نہیں ہے۔“ ذرا دیر بعد ہی وہ اندر تیزی سے آیا تھا۔ کچھ کاغذات اس کے ہاتھ میں تھے۔

ایک لمحے کے لیے ایما کو لگا، اس کا دل بند ہو جائے گا۔ نہ جانے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ شاذان حیات ملک سے نہیں، اس کی زندگی سے جا رہا ہے۔ مگر اس وقت کچھ کہنے کا موقع تھا نہ مہلت۔ وہ خاموشی سے پیکنگ کرتی رہی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ ضروری چیزیں اُسے نکال کر دیتا رہا اور جب پلٹا تو وہ خود پر ضبط کے پہرے لگائے چہرہ جھکائے بیٹھی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

لیکن اس وقت کچھ کہنا آ بگینوں کو ٹھیس لگانے کے مترادف تھا۔ سو خاموشی سے سوٹ کیس اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ گرینی حسبِ عادت پانچ بجے جاگ اُٹھی تھیں۔ راہداری میں قدموں کی چاپ سُنی تو باہر نکل آئیں شاذان کپڑے

بدل کر نیچے چلا آیا تھا، ایما بھی متورم چہرہ لیے ساتھ کھڑی تھی۔

”ارے تم کہیں جا رہے ہو بیٹا؟“ گرینی اُسے یوں اچانک تیار دیکھ کر متحیر رہ گئی تھیں، کل تو کوئی ایسا پروگرام نہ تھا۔

”جی گرینی! ان فیکٹ میرا پارٹنر ... میرا بزنس پارٹنرخت ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں ہاسپٹلائزڈ ہے، اُسے میری ضرورت ہے ... میں جاؤں گرینی؟“ بریف کیس نیچے رکھ کر اس نے ان کا ضعیف ہاتھ محبت سے تھام کر لبوں سے لگا لیا تھا۔

گرینی اس اچانک اُفتاد کے لیے تیار نہیں تھیں، مگر اس کی سعادت مندی اُنہیں نہال گئی۔

”میں کیا اجازت دوں بیٹا ... اب تمہاری بیوی ہے۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں مہندی کا رنگ بھی ہلکا نہیں پڑا اور تم یوں جا رہے ہو غیر معینہ مدت کے لیے۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ جہاندیدہ نظریں ایما کے چہرے کو پڑھ آئی تھیں ...

”اُسے کوئی اعتراض نہیں گرینی ایما میری لائف پارٹنر ہے ... اگر وہی انڈراسٹینڈ نہیں کرے گی تو کون کرے گا؟“ اس نے کچھ جھجکتی ہوئی نظر ایما پر ڈالی تھی ... جس نے بے ساختہ اس جملے پر نگاہ اٹھا کر اُسے دیکھا تھا۔ وہ کس دیدہ دلیری سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا مگر اس طرح نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر نہیں جاتے ... خاندان، برادری والے کیا کہیں گے؟“ وہ کچھ نیم رضامندی سے بولیں تو وہ تلخی سے مسکرایا۔

”مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں ... بس آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا۔“

ایک بار پھر اس نے گرینی کا ہاتھ لبوں سے لگا لیا تھا۔ اس کی گرینی سے محبت مسلم تھی۔ ایما ان دونوں کے درمیان خود کو اجنبی سا محسوس کیے بنا نہ رہ سکی۔ خاص طور پر اس کا یہ کہنا کہ مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں۔ اُسے لگا اُسے باقاعدہ جتایا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ آنسو گال پر پھسل کر اُس کے گلابی دوپٹے میں جذب ہو گئے تھے۔

”میں تمہیں غلط سمجھ ہی نہیں سکتی میرے بچے کہ تم تو میرا سرمایہ ہو۔“ گرینی نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا جس کے چہرے پر شدید تشویش اور تفکر کے آثار تھے۔

”تھینکس گرینی ... چلیے مجھے دروازے تک چھوڑ آئیے۔“ اس نے ان کے کندھے پر بازو پھیلا کر سوٹ کیس اٹھا لیا۔ ایما دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ حساس دل کے لیے اس کا ایک ایک عمل چرکہ لگانے کے مترادف تھا۔

”بیٹا ایما آؤ۔“ گرینی نے ہی اسے پکارا تھا اور وہ یہ سوچتی چلی آئی کہ اس کے آنے نہ آنے سے کیا فرق

پڑتا ہے۔ بہر حال اس کی حیثیت ایک ورکر ہی کی تو ہے۔ پہلے وہ آفس میں کام کرتی تھی اور نقد تنخواہ پاتی تھی اور اب یہاں گھر میں ایک کیئر ٹیکر بنا کر لائی گئی تھی جس کی تنخواہ کے طور پر حق مہر، گھر میں حکم چلانے کا حق اور ہر طرح کی آزادی حاصل تھی۔

مگر کیا وہ واقعی آزاد تھی؟ یا یہ آزادی ایک طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی۔  
”جلدی آنے کی کوشش کرنا بیٹا... میں نے تو سوچا تھا تم دونوں ساتھ جاؤ گے، دُنیا گھومو گے... جلدی آکر ایما کو بھی اپنے ساتھ لے جانا۔“ گرینی کہہ رہی تھیں۔

وہ سعادت مندی سے سر ہلا گیا۔ ایما کا دل دکھ کر رہ گیا ایک گرینی کو خوش کرنے، اُنہیں سکھ دینے کے لیے اس نے ایما کا وجود بھٹی کی نذر کر دیا تھا ”میں پوری کوشش کروں گا گرینی۔“

”چلو اللہ کی امان میں... ارے ایما تم وہاں کیوں کھڑی ہو بیٹا... اسے ایئر پورٹ تو چھوڑنے جاؤ۔“ گرینی کی اس پر یکدم نظر پڑی تو کہہ اُٹھیں۔ دونوں چونک گئے۔

”نہیں گرینی وہ...“ شاذان کے چہرے کا تناؤ ایک نگاہ میں اس نے پرکھ لیا تھا۔  
”نہیں کا کیا مطلب... تم جاؤ اسے بھی ڈھارس رہے گی۔“ اُنہوں نے اس کا شانہ تھپک کے کہا تو وہ لاچاری سے شاذان کی طرف دیکھنے لگی۔

”بیٹھ جاؤ ایما! دیر مت کرو۔“ کچھ سوچ کر اس نے اجازت دے دی تھی۔ گرینی کو وہ ذرا بھی شک نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ ڈرائیور خاموشی سے کار اسٹارٹ کر کے روڈ پر لے آیا تو دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔  
کچھ دیر بعد وہی چونکا تھا۔ اس کی طرف رُخ پھیر کر دیکھا۔

باہر سے آنے والی روشنی میں اس کے گالوں پر نمی چمک رہی تھی۔ اس نے گہری سانس بھری۔  
”ایما!“ بہت آہستگی سے پکارا تھا۔ وہ میکا کی انداز میں اس کی طرف مڑی۔  
”گرینی کا خیال رکھنا... مجھے تم پر ٹرسٹ ہے۔“ اس کے گود میں رکھے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے وہ بولا تو بے اختیار وہ رو پڑی تھی۔

”پلیز ٹیک اِٹ ایزی...“ اُسے سمجھاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا، پھر اس کا چہرہ اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ ساکت سی رہ گئی۔

”مجھے گرینی اور کرسٹینا دونوں عزیز ہیں۔ یہاں گرینی ہیں تو وہاں کرسٹینا۔ میں یہاں واپس ضرور آؤں گا۔ سو ڈونٹ بی اسکیر ڈ!“ اس کی آنکھوں میں بے پناہ محبت تھی گرینی کے لیے، کرسٹینا کے لیے مگر اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایک حرف تسلی بھی نہیں۔ کوئی جذبہ محبت بھی نہیں۔  
حتی کہ رشتے کی فطری اپنائیت تک نہیں تھی۔

وہ اس کے نزدیک بیٹھا تھا، مگر اُسے خود سے کوسوں بلکہ ہزاروں میل کے فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا۔  
نجانے ایک لمحے میں اس نے کیا کیا سوچ لیا تھا۔ شاذان اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتا رہ گیا۔  
”میں جانتی ہوں سر۔“ بہت دیر بعد اس کے لبوں نے جنبش کی تھی۔

شاذان نے ہونٹ بھیج کر رخ پھیر لیا۔ آج اس نے یہ نہیں کہا کہ مجھے سرمت کہو، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب اس نے اپنی حیثیت جان لی ہے۔

جناب ٹرینل پر حسبِ معمول رونق اور چہل پہل تھی۔ ”اللہ حافظ!“  
وہ اُس کے ساتھ اوپر آئی تھی دکھے دل سے اللہ حافظ کہا تو تیزی سے آگے کی طرف بڑھتے شاذان نے بے ساختہ مڑ کر اُسے دیکھا ”اللہ حافظ اینڈ ٹیک کیئر!“

اس کا گال کسی بچے کے رخسار کی طرح تھپتھا کر وہ آگے بڑھا اور بڑھتا چلا گیا، حتیٰ کہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔ جانے اس کی آنکھیں دھندلائی تھیں یا وہ واقعی اوجھل ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر یوں لگا جیسے وقت ٹھک گیا ہو۔ دن اور رات کا سیل رواں منجمد ہو کر رُک گیا ہو۔ ہر شے پر اداسی چھا گئی تھی۔ تھکن اور خاموشی نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ایسے میں گرینی کی محبت اور ہر دم خیال رکھنے والی عادت نے اُسے مدہوشی اور خود فراموشی سے بچائے رکھا۔  
سارا دن وہ ان کے پاس رہتی، اُن کی سنتی، کبھی کبھی اپنی بھی سناتی۔ اُن کی خدمت کرتے ہوئے بس ایک ہی سرگوشی سنائی دیتی۔

”گرینی کا خیال رکھنا، مجھے تم پر ٹرسٹ ہے۔“  
گرینی واقعی محبت کرنے والی عورت تھیں۔ ان کی سنگت میں اُسے اپنے زخم مندمل ہوتے لگتے۔ شاذان نے انجانے میں ہی سہی، اس پر ایک احسان کر دیا تھا۔

گرینی جیسی سچی اور پر خلوص ہستی کا ساتھ اُسے عطا کر دیا تھا، وہ خوش تھی اس مہربانی پر۔ اُدھر شاذان نے جا کر محض ایک بار فون پر خیریت کی اطلاع دی تھی۔ گرینی نے ایما کو فون تھمایا تو اُدھر سے یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں۔  
”گرینی کا خیال رکھنا، دوا اور کھانا وقت پر دینا۔ احتشام اور ڈاکٹر بلکرامی سے کانٹیکٹ کرتی رہنا۔ اُنہیں اکیلا مت چھوڑنا اور اُنہیں کچھ مت بتانا۔“

اس کے لیے ایک جملہ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔ لائن ڈسکنیکٹ ہوئی تو کتنی ہی دیر وہ محض گرینی کی خاطر موبائل کان سے لگائے کھڑی رہی جو بظاہر کتاب پڑھتے ہوئے بھی اس کی طرف متوجہ تھیں۔

اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ گرینی کے لیے ”دکھ“ اور ”صدمہ“ زہر قاتل ہے۔ اس کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو

چکا تھا، مگر اس کا بدلہ وہ گرینی سے نہیں لے سکتی تھی۔ شاذان نہ بھی کہتا تب بھی وہ گرینی کو کچھ بتانے والی نہیں تھی۔ ایک اُنہی کا تو آسرا تھا۔ اُنہیں کھو کر وہ خود بکھر جاتی سو ان کا وہ خود سے بڑھ کر خیال رکھتی۔ اُنہیں ہر ممکن خوشی فراہم کرتی۔

خود سے البتہ وہ بے نیاز تھی۔ گرینی ٹوکتیں تو کپڑے تبدیل کر لیتی۔ زیور کے نام پر گرینی کے اصرار کی وجہ سے اس نے گولڈ کی زنجیر پہنے رہتی تھی۔ ساتھ ہی کانوں میں ٹاپس تھے۔ ہاتھوں میں بھی گرینی اُسے چوڑیاں پہنائے رکھتیں۔ طلائی چوڑیاں اس کی سنہری کلائیوں میں خوب چچکتیں۔ ناک میں ہیرے کی نوز پن اور اُنکلیوں میں طلائی انگوٹھیاں۔ اگر شاذان کی محبت اُسے ملتی تو شاید ان گہنوں کی اُسے صحیح معنوں میں خوشی ہوتی مگر جب وہ ہی نہیں تو سب بیکار لگتا تھا۔

نہیں دیکھنے والا جب کوئی

کھل جاؤ تو کیا گہناؤ تو کیا

گرینی سمجھتی تھیں کہ اُسے کون سا غم کھائے جا رہا ہے وہ کس لیے بولائی بولائی پھرتی ہے۔ دروازے پر ہونے والی دستک اور فون کی ہر بیل اُسے کیوں چونکا دیتی ہے، مگر وہ کیا کر سکتی تھیں۔ شاذان کی ”مجبوری“ اُنہیں کچھ بھی کہنے سے روک دیتی۔

پورا مہینہ اسی طرح گزر گیا تھا۔ شاذان نے گرینی سے بعد میں بھی کئی بار رابطہ کیا مگر ایما سے بات نہیں کی۔ گرینی اُسے واپسی کا کہتیں تو وہ ڈھیروں مسئلے بنا کر اُنہیں خاموش کر دیتا۔ ایما کو نہ اس نے کال کیا اور نہ وہ کر سکی کیونکہ اُسے شاذان کا فون نمبر معلوم نہیں تھا، تاہم گرینی کو وہ مصلحتاً جھوٹ بول کر مطمئن کر دیتی۔ اور شاید یہی وجہ تھی شاذان بھی مطمئن تھا۔ اُسے اندازہ تھا وہ کہ گرینی کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ یوں بھی ہر فون کال پر گرینی اس کے گن گا رہی ہوتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سِطاق جاں نہ چراغ ہے پسِ بام و شب نہ سحر کوئی  
عجب ایک عرصہ درد ہے نہ گماں ہے نہ ہے خبر کوئی  
نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی  
غم بے کسی نے مٹا دیا میرے دل میں تھا بھی اگر کوئی  
تیرے بے رُخی کے دیار میں گھنی تیرگی کے حصار میں

جلے کس طرح سے چراغِ جاں کرے کس طرح سے سفر کوئی  
 کٹے وقت چاہے عذاب میں کسی خواب میں یا سراب میں  
 جو نظر سے دور نکل گیا، اُسے یاد کرتا ہے ہر کوئی  
 وقت کچھ اور آگے گزرا۔ چار ہفتے اور بیت گئے تھے۔ ان دو ماہ میں وہ ”حیاتِ ولا“ میں رچ بس گئی تھی۔  
 یعنی اس دوران کافی مرتبہ گھر آئی۔ مگر باوجود بے حد دوستی کے اس نے شاذان اور اس کے رویے کی بابت اُسے کچھ  
 نہیں بتایا۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے  
 بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی  
 اور اُسے یہ رسوائی منظور نہ تھی کہ بہر حال اب اس کی توقیر و عزت اس کے شوہر کے نام سے ہی تھی۔ گو کہ  
 وہ جانتی تھی کہ سہاگن وہی ہے جو پیا من بھائے، مگر پھر بھی ایک چھت کا آسرا تو تھا۔ ان ہی دنوں جب وہ اپنے  
 انٹر کے زلٹ آؤٹ ہو جانے پر سنجیدگی سے پرائیویٹ بی اے کرنے کا سوچ رہی تھی اور شاذان کی آمد سے تقریباً  
 مایوس ہو چکی تھی، تو ایک رات اچانک وہ چلا آیا۔ اس رات گرینی کو دودھ اوٹین دے کر وہ اپنے کمرے میں آئی تو  
 نجانے کیوں شادی کا البم نکال کر دیکھنے کو دل چاہنے لگا تھا اور پھر اُسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس نے اپنے گرد  
 ڈھیروں تصویروں کا نبار لگا لیا تھا۔

آنسو بنا بھائے ہی اس کے گالوں سے پھسلنے لگے تھے اور ان ہی اشکوں کی دیوالی کرتے کرتے نجانے کب  
 اس کی آنکھ لگ گئی۔ جس لمحے شاذان ماسٹر کی سے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، رات کے ساڑھے چار بج  
 رہے تھے۔ سامنے بیڈ پر تصویریں اپنے گرد بکھرائے وہ سفید شلوار قمیص میں سوئی ہوئی تھی جس کے گالوں پر آنسوؤں  
 کے نشان تھے۔

شاذان ٹھٹک سا گیا۔ شادی والے دن کی وہ فریم شدہ تصویر جس میں احتشام نے زبردستی شاذان کو بٹھا کر  
 ان دونوں کی یادگار تصویر بنوائی تھی، ایما کے بازو پر دھری تھی۔ اے سی کی خنکی نے اس کے آنسوؤں کو منجمد کر دیا تھا۔  
 شاذان بریف کیس رکھ کر بے ساختہ بیڈ کی طرف بڑھا تھا۔ جھک کر اُسے دیکھا۔ نیند کی بے خبری میں اُس  
 کے چہرے پر اندرونی خوبصورتی ابھر آئی تھی۔ سادگی اور بے ریا خلوص۔ بے ساختہ اس کے لب بھنج گئے تھے۔  
 تصویریں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

ایک لڑکی اور اس کے جذباتوں کا بڑی بے دردی سے استحصاں ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا، واقف تھا اپنے قصور  
 سے اس لیے خود سے لڑنے لگا۔ ایسے میں نظر اس کی طرف اٹھی تو جیسے مسحور سا رہ گیا۔ کوئی فسوں تھا اس کی شخصیت  
 میں۔ ریشمی بالوں کا آبشار بیڈ سے نیچے گر رہا تھا۔ کسی احساس میں گھر کر وہ بے ساختہ جھٹکے سے مڑا تھا اور تیز تیز

قدموں سمیت دروازے سے نکلتے ہوئے اپنا بریف کیس نہیں بھولا تھا۔

صبح بے حد خوشگوار تھی۔ وہ اُٹھی تو رات کی ”برسات“ نے چہرے کو پھول کی طرح کھلایا ہوا تھا۔ آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ پپوٹے سوج سے گئے تھے۔

وہ شاور لے کر فریش ہو گئی تھی، مگر آنکھوں کا گلابی پن ہنوز برقرار تھا۔ آئی ڈراپز ڈالنے کا ارادہ کر کے جس لمحے وہ سر پر تولیہ لپیٹے سبز لان کے سوٹ میں باہر نکلی، بیڈ پر بیٹھے شاذان کو دیکھ کر جیسے ٹھٹک ہی گئی۔

ادھر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور یونہی مسکرا دیا تھا۔  
”آپ!“ وہ آہستگی سے دو قدم آگے آئی تھی۔ خود کلامی کے انداز میں بولی جیسے سامنے کا منظر محض نظر کا دھوکہ، کوئی واہمہ ہو۔

”کیسی ہو؟“ شاذان کی بھاری آواز گونجی تو سماعتوں نے بصارتوں کو یقین بخشتا تھا۔  
”آ... آپ... کب آئے؟“ اب کے بڑی بے ساختگی سے وہ لپک کر اس کے نزدیک آگئی تھی۔  
شاذان نے اس کی متحیر آنکھوں میں دیکھا جہاں رات کی کارگزاری واضح نظر آ رہی تھی۔  
”بس ابھی ابھی... جب تم نے مجھے یاد کیا تھا۔“

نجانے کیسے اس کے منہ سے جملہ نکل گیا تھا اور وہ جو اُسے اتنے دن بعد سامنے پا کر حواس کھو رہی تھی، اسی بے ساختگی سے بولی۔

”ایسی بات نہیں ہے، میں تو آپ کو ہر وقت یاد کرتی تھی بلکہ...“  
جواباً شاذان کی مونچھوں تلے بھنچے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی تو وہ خود فراموشی سے جیسے جاگ اُٹھی۔ نظر فوراً جھک گئی تھی۔

”میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ سنجیدگی سے کہہ کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر اس نے روک لیا۔ ایما مڑ کر حیرانی سے دیکھنے لگی۔

”مجھے فی الحال چائے کی ضرورت نہیں ہے... تم یہاں بیٹھو! تم سے بات کرنی ہے۔“  
لہجے میں نرمائیں جھلک آئی تھیں۔ وہ سرتا پیر جیسے کسی ان دیکھی آگ میں جھلنے لگی تھی۔ شاکی نظروں سے اُسے دیکھا۔ اُسے لگا شاذان کی نگاہوں کی گرفت اس کو جھلسا رہی ہے۔ جب یہاں تھا تو اُسے کسی چیز کی طرح برتا تھا اس نے... چلا گیا تو پلٹ کر حال تک نہ پوچھا۔ اب پھر آیا تھا۔

اس کے انداز پہ شاذان نے ناگواری سے بھرپور کاٹ دار نظر اس پر ڈالی جس نے اُسے سہا دیا۔  
فطری طور پر وہ بزدل تھی۔ اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو بیٹھ گئی۔ اور جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تو بے ساختہ کہہ اُٹھی۔

”گرینی بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے آپ کی ہدایت پر مکمل عمل کیا تھا۔ ان کے بی پی کا ریکارڈ ایک فائل میں لکھ رکھا ہے۔ اسی میں دواؤں کی تفصیل بھی ہے اور مختلف ٹیسٹوں کی کاپیاں بھی۔ آپ کہیں تو لا کر دکھاؤں؟“

بنا کہے اس کے سوال کا جواب دے کر وہ بچوں کی سی سادگی سے استفسار کر رہی تھی۔ شاذان نے بلا ارادہ اُسے دیکھا۔ وہ واقعی ایسی تھی کہ لاکھ وہ اسے نظر انداز کرنے کا عزم لے کر آیا تھا، مگر پہلے ہی مرحلے پر ہار گیا تھا۔ جواباً وہ نفی میں سر ہلا کر اُٹھ گیا۔

گرینی کے لیے اس کی آمد ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہ تھی۔ ان سے ملنے وہ ان کے کمرے میں گیا تو اُنہوں نے اُسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ جبکہ وہ اس تمام عرصے خود پر ضبط کرتی ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔ شادی کے اولین دنوں میں سمجھوتے اور بے اختیاری کا جو سبق اس نے خود کو پڑھایا تھا۔ وہ اس کی انا کو بھول چکا تھا۔ دوبارہ یاد کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

وہ کم سن کم عمر سہی، مگر احساس و ادراک رکھتی تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ شاذان کے لیے کیا تھی۔ اس کا دل جل رہا تھا، مگر رشتے کی نزاکت اُسے زبان بندی پر مجبور کر رہی تھی۔ اور جب کچھ دیر بعد انا کا غبار بیٹھا تو سامنے مجبوری اور بے بسی کا صحرا دور تک پھیلا نظر آیا۔

”اب تو زندگی یونہی گزرنی ہے ایما شاذان علی۔“

وہ خود سے مخاطب تھی۔ شاذان نے اس کے تیوروں سے بہت کچھ بھانپ لیا تھا۔ وہ کچھ نادم نادم سا تمام وقت گرینی کے پاس بیٹھا رہا اور وہ میکا کی انداز اختیار کیے کچن میں اس کے پسندیدہ پکوان بناتی رہی۔

رات کے لیے احتشام نے فون پر ان تینوں کو مدعو کر لیا تھا۔ ایما نے گرینی کو ساتھ جانے کے لیے بمشکل تیار کیا جو کباب میں ہڈی بننے کے لیے آمادہ نہیں تھیں، مگر اس کی محبت کے آگے ہار گئیں۔

شاذان نے اس کا گریز محسوس کر لیا تھا، مگر زیادہ دیر اُسے ذہن پر سوار نہ کر سکا کہ ذہن اپنی ہی الجھنوں میں گرفتار تھا۔ احتشام کی طرف جاتے ہوئے ایما نے بھی اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔ جیہی قصداً کچھ ایسا موضوع چھیڑا کہ گرینی اور وہ آپس میں محو گفتگو ہو گئے جس پر وہ مطمئن ہو کر پھر تمام وقت کار سے باہر دیکھتی رہی۔

ثنا بھابی نے ان دونوں کو ساتھ آتے دیکھا تو خوب چھیڑا۔

”ماشاء اللہ! ایما تو کھل اُٹھی ہے شاذان کی آمد سے۔“

شاذان کے سامنے اُنہوں نے برملا کہا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔ شاذان نے اُسے دیکھا تو اس نے نظر چرائی تھی۔ کچھ دیر وہ سب ساتھ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ پھر وہ ثنا بھابی کے پاس کچن میں چلی آئی۔ احتشام اور شاذان غالباً آپس میں کچھ کہنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔

اس نے محسوس کیا تو گرینی کو بہانے سے اُٹھا لائی۔ شاذان نے اُسے ممنونیت سے دیکھا تھا۔ ”کیسے یہ



میرے دل کا حال جان گئی اور ایک وہ ہے جسے میں نے چاہا، مگر اُسے  
میرے خوابوں اور میرے احساسات کی ذرہ برابر پرواہ نہیں، نجانے کیوں؟  
“

”ہیلوشاذان کہاں کھو گئے؟ سب خیریت تو ہے؟ جب سے آئے  
ہو الجھے الجھے لگ رہے ہو؟“ احتشام نے اُسے ٹوکا تو وہ خیالات کی دنیا  
سے نکل اس کی طرف متوجہ ہوا۔ احتشام کی گود میں اس کا ایک سالہ بیٹا  
کھیل رہا تھا۔

شاذان نے اُنگیوں سے اس کے بال بگاڑتے ہوئے اُسے  
گدگدایا تو وہ کھلکھلانے لگا۔

”تمہارا بچہ مجھے بہت پیارا لگتا ہے شامی ... اُسے مجھے دے دو۔  
“ اس کے سوال کو وہ نظر انداز کر گیا تھا۔ احتشام مسکرایا۔

”تمہارا ہی ہے البتہ لے جانے کی بات مت کرو ... ثنا کی جان  
بند ہے اس میں ... وہ اُسے دینے والی نہیں۔“  
”کیوں؟“ شاذان نے ابرو اُچکا کر قدرے اچنبھے سے پوچھا  
تھا۔

”دماغ درست ہے برخوردار! وہ ماں ہے اس کی۔“  
احتشام نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے اُسے ایک دھپ  
جمائی تو وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا دیا۔  
”وہ تو ہے یار ... میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا ... بھابھی واقعی

بہت لوگ مدر ہیں۔“

”ان فیکٹ ساری مائیں ہی اپنے بچوں کے معاملے میں بڑی حساس ہوتی ہیں۔“ احتشام نے بیٹے کو محبت پاش پدرانہ شفقت بھری نظروں سے دیکھا۔  
”ساری نہیں محض چند ایک!“

احتشام کی بات پر اس نے کچھ ایسے زہر خند لہجے میں کہا کہ وہ چونک سا گیا۔  
”کیا بات شاذان ... مجھے تم بہت پریشان لگ رہے ہو ... سب خیریت تو ہے نا ... کرسٹینا کیسی ہے؟ کیا اس سے جھگڑا ہوا ہے؟“ احتشام تو جیسے اسی میں اترا ہوا تھا۔ وہ نظر چرا کر سگریٹ سلگانے لگا، مگر جب ادھر سے اصرار بڑھا تو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

”بس یار! میں اب لائف سیٹل کرنا چاہتا ہوں، فیملی بنانا چاہتا ہوں، مگر کرسٹینا اس معاملے میں کو آپریٹ کرنے کو تیار نہیں ... ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور وہ ہے کہ فیملی بڑھانا نہیں چاہتی ... تم کہتے ہو کہ مائیں سنسیٹیو ہوتی ہیں جبکہ اُسے خدا نے دو بار یہ نعمت عطا کرنی چاہی اور اس نے ٹھکرا دی۔“ وہ بے حد مضطرب انداز میں بتاتا چلا گیا۔

احتشام کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ ”آئی سی ... کب ہوا یہ سب ... تم نے منع نہیں کیا۔“  
”مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ پہلے میں یہاں آیا ہوا تھا جبکہ اب اس نے اسی ویک میرے منع کرنے کے باوجود ... اوہ احتشام!“ کہتے کہتے اس نے انگلیاں بالوں میں پھنسا لی تھیں۔  
”اس نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے یار۔ تھک گیا میں ٹوٹ گیا۔“ اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔

احتشام نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”ٹیک از ایزی یار ... میں تمہارے احساسات سمجھتا ہوں ... میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ تمہیں یقیناً بُرا لگے گا مگر کرسٹینا نے آج تک سوائے تمہیں ٹینشنز کے کچھ نہیں دیا۔“  
اس کی بات پر شاذان نے اضطراری انداز میں ہونٹ بھیجنے تو وہ کچھ سوچ کر چپ ہو گیا۔ پھر مسکرا کر بولا  
”اینی وے یار ... تمہیں کیا مسئلہ ہے تمہاری تو دو دو بیویاں ہیں۔“

اس کے لہجے میں مخصوص شرارت تھی۔ شاذان نے سنجیدگی سے اُسے دیکھا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔  
”آئی ایم سیریس یار ... ایما بہت اچھی لڑکی ہے وہ ایک اچھی ماں بھی ثابت ہوگی ... تمہاری نسل کی بہترین تربیت کر سکتی ہے وہ ...“

”کم آن احتشام ... شی از ٹو یگ۔ (وہ بہت چھوٹی ہے)۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر کہہ اُٹھا تھا۔ لہجے میں متفق نہ ہونے کا واضح عندیہ تھا۔ ”یوں بھی اس کے آگے ابھی پوری لائف پڑی ہے ... میں اسے ایسے کسی جھمیلے میں

پھنسنا نہیں چاہتا ... معلوم نہیں آگے جا کر میرا اور اس کا ریلیشن قائم بھی رہتا ہے کہ نہیں ... تمہیں تو معلوم ہے نا کہ میں اس کی زندگی اسپوائل نہیں کرنا چاہتا۔“

بنا سوچے سمجھے وہ بولے چلا گیا تھا۔ احتشام حیرت اور تاسف سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ چونکا۔ کسی کی گہری نظر کی تپش نے اسے چونکا دیا تھا۔

برق کی تیزی سے اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ایما دروازے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ جانے اس کے کچھ سنا بھی تھا کہ نہیں، تاہم اس کے چہرے پر مکمل سکوت اور نارمل سے تاثرات تھے۔

”احتشام بھائی ثنا بھابی آپ کو بلا رہی ہیں ... کھانا لگ گیا ہے۔“ وہ یہی پیغام لے کر وہاں آئی تھی۔ شاذان سمیت احتشام نے بھی سکون کا سانس لیا۔

”تم سے اس موضوع پر پھر بات ہوگی، فی الحال اُٹھو کھانا لگ گیا ہے۔“ اُسے بری طرح گھورتے ہوئے احتشام نے باقاعدہ غصے میں کہا تھا۔ شاذان محض سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

پھر تمام وقت ثنا اور احتشام کے ہنسی مذاق کا ساتھ دیتے ہوئے وہ مستقل ایما کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہاں ایک ہی تحریر لکھی نظر آ رہی تھی۔ ثنا بھابی کے شوخ جملوں پر حیا کی تحریر ... اور فطری بھولپن۔

☆.....☆.....☆

یہی نہیں کہ میرا دل ہی بس میں نہ تھا

وہ جب ملا تو میں اپنی ہی دسترس میں نہ تھا

راکنگ چیئر پر آنکھیں موندے لیٹے اس کی سوچوں کی پرواز کرسٹینا اور ایما کے درمیان ہو رہی تھی۔ جس میں ایما کی چوڑیوں کی کھنک بار بار رخنہ ڈال دیتی تھی۔

اس لمحے وہ شاید بیڈ کور ٹھیک کر رہی تھی۔ اس مستقل کھن کھن کے باعث اس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ روٹین کے سادہ سے حلیے میں بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنائے وہ کمرہ ٹھیک کر رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اُسے کرسٹینا کا خیال آ گیا جسے گھر داری سے دوسری انگریز عورتوں کی حد تک بھی دلچسپی نہ تھی جبکہ وہ ترتیب اور توازن کا خوگر تھا۔ کرسٹینا سے اکثر اس کا جھگڑا بھی ہوتا تھا اور ہمیشہ وہی ہتھیار ڈالتا کیونکہ لاشعوری طور پر اُسے کرسٹینا کے گھر چھوڑ جانے کا خوف تھا۔

مگر جب وہ یہاں آتا تو گرینی اس کا اسی طرح خیال رکھتیں اور ملازموں سے رکھواتیں جیسا کہ پاکستان معاشرے میں مردوں کی روایتی خدمت کی جاتی ہے۔

اس نے ایما پر گہری نظر ڈالتے ہوئے سوچا کہ اگر اس نے گرینی کی پسند کردہ اپنے طبقے کی لڑکی سے شادی کی ہوتی تو واقعی اُسے اتنی سہولت اور آسانی ہرگز حاصل نہ ہوتی۔

ایما جیسی کم عمر اور سادہ لوح لڑکی ملنا کم از کم اس کے حلقہ احباب میں تو ناممکن تھا۔ رشتوں کو خلوص سے نبھانے اور بنا غرض کے اپنا فرض نبھاتے چلے جانے کی خو کو شاذان نے صرف اسی میں دیکھا تھا۔ احتشام کا فیصلہ کتنا صحیح تھا۔

مگر اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے اندر احساسِ جرم جاگنے لگتا، اُسے خود سے شرم آنے لگتی۔ ”ایسی حساس اور جذبوں سے بھرپور لڑکی یوں ضائع کرنے کے لیے تو نہیں بنی تھی۔“ اس کا ذہن اُسے کچھ کے لگاتا۔ دل الگ دہائیاں دیتا جس میں کرسٹینا کا عکس بسا تھا۔ جب تک وہ انگلینڈ میں رہا، اُسے اس ”احساسِ جرم“ سے نجات ملی رہی، مگر یہاں آکر پھر سے ضمیر جاگنے لگا تھا۔

شاذان کی نظروں کا ارتکاز بالآخر اُسے متوجہ کر ہی گیا۔ بے ساختہ نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ”آپ چائے پیئیں گے؟“ یہ اس کا مخصوص جملہ تھا۔ سخت نروس ہوتے ہوئے وہ اسی طرح اس کی توجہ خود سے ہٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ شاذان کے ہونٹوں کی تراش میں مدہم سی مسکراہٹ آ رہی۔

”ہوں ... لے آؤ۔“ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس نے جواب دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی چائے شاذان کو واقعی پسند تھی۔

چائے بنا کر جس لمحے وہ کمرے کی طرف آئی اندر سے آنے والی آواز پر قدم رُک گئے۔ شاذان کسی سے فون پر انتہائی سخت لہجے میں انگریزی میں مخاطب تھا۔

اس کا وجود سست پڑ گیا۔ دوسری طرف کون ہو سکتا تھا، سمجھ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مگر وہ حیران ضرور ہوئی کہ کرسٹینا سے غصیلے لہجے میں بات کی جا رہی ہے جسے اکثر اس کی موجودگی میں بھی ہنی اور ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ ایسے میں خود کمرہ چھوڑ آتی کہ اس پتھر کے انسان کو احساس نہیں تھا اس کے جذبات کا۔ لیکن اس وقت ہونے والی اس گفتگو نے اُسے ششدر کر دیا تھا۔ کرسٹینا غالباً اس کے واپس آنے کا مطالبہ کر رہی تھی اور وہ اپنی ناراضگی کا اظہار۔

”اب میں اُسی وقت واپس آؤں گا کرسٹینا جب تم مجھ سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لو گی اور دوبارہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرو گی ... یہی میرا فیصلہ ہے ... مجھے اپنی فیملی مکمل چاہیے۔“ انتہائی تلخ لہجے میں کہہ کر اس نے **کال کاٹ دی تھی**۔ ایما کے ہاتھ میں کپ لرز گیا۔ چند منٹ بعد وہ بڑی ہمت کر کے اندر داخل ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے شاذان کو دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

”چائے۔“ نرم لہجے میں کہہ کر اس نے کپ بڑھا دیا تھا۔ شاذان کچھ چونکا، نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ دہل سی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شدت ضبط سے سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور چہرے پر خشونت تھی۔

”آپ چائے پی لیجیے میں چلی جاتی ہوں۔“ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے وہ سراسیمہ لگ رہی تھی۔

”کپ یہاں رکھ دو اور میرا سر دباؤ، سخت درد ہو رہا ہے۔“ نظر چراتے ہوئے شاذان نے بیزاری سے کہا تھا۔ اس نے تعیل میں دیر نہ کی۔ کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ مڑی تھی، پھر کچھ جھک گئی۔

”آپ ٹیبلٹ لے لیں۔“

اُنگلیاں چٹختاتے ہوئے اس نے بمشکل کہا تھا۔ اس کے غصے سے سخت خوف آتا تھا اُسے۔ شاذان نے انتہائی ناگواری سے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا۔

”میرا وجود اتنا برا لگنے لگا ہے کہ سر تک دبانے کی روادار نہیں ہو۔“ تلخ لہجے اور تیز نگاہوں نے اس کی گویائی جیسے ضبط کر لی تھی۔ کانپتی ہوئی مومی اُنگلیاں جھٹ سے اس کی پیشانی پر رکھ دی تھیں اس نے۔ ایک ٹھنڈک سی اس کی رگوں میں اُتری تھی۔

شاذان نے بمشکل اپنی مسکراہٹ ضبط کی جو اس وقت اس کی ہراساں صورت دیکھ کر بکھر جانے کو مچل گئی تھی اور پھر یہ شاید اس کی ذہنی تھکان کا نتیجہ تھا یا ایما کے مسیجائی لمس کا اثر کہ دس منٹ بعد وہ سو گیا تھا۔

اُسے یوں پرسکون انداز میں سوتا دیکھ کر اس کا دل یونہی خوش ہو گیا کہ ذرا دیر پہلے اُسے پریشان دیکھ کر جو چوٹ اس کے دل کو لگی تھی اس پر جیسے مرہم رکھ دیا تھا کسی نے۔

☆.....☆.....☆

یہ بھی نہیں کہ ساتھ ہے میرے وہ ہم نفس  
یہ بھی غلط کہ مجھ سے جدا ہو گیا وہ شخص

لندن سے آنے والی کالز کا تانتا بندھ گیا تو بالآخر اس نے رخت سفر باندھ ہی لیا۔ ایما گو کہ واقف تھی کہ اس نے ہمیشہ ساتھ نہیں رہنا۔ مگر ایک بار پھر اندر تک زخمی ہو گئی۔ معلوم نہیں کہ کرسٹینا نے اس سے معافی مانگی تھی یا نہیں، تاہم یہاں سے جاتے ہوئے شاذان کافی سنجیدہ تھا۔ وہ اُسے گرینی کی ہدایت پر سی آف کرنے ایئرپورٹ آئی تھی۔

”اللہ حافظ! اپنا خیال رکھیے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اس کے لہجے میں گھل گئے تھے۔ شاذان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”تم بھی اپنا خیال رکھنا کہ تمہاری بے حد ضرورت ہے ... گرینی کو ...“ وہ نہ جانے کس خیال میں کہہ اٹھا تھا۔ اس نے چوک کر نظر اٹھائی تو اس نے ”گرینی کو“ کہہ کر جیسے اپنی بات کی تشریح کر ڈالی۔

بڑا شدید دھچکا لگا تھا۔

یکدم وہ ایڑیوں کے بل مڑی تھی اور پھر پلٹ کر دیکھے بغیر تیز قدموں سے چلتی ساکت کھڑے شاذان کو متاسف کرتی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

”مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا... نہ جانے کیوں میں اسے ہمیشہ یہ جتاتا ہوں کہ وہ میرے لیے کچھ نہیں۔“  
دل کے احتجاج پر اس نے سوچا تھا۔

”لیکن نہیں، یہی رویہ ٹھیک ہے... آج نہیں تو کل ہمیں الگ ہونا ہے... ایسے میں اچھا ہے کہ وہ پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار رہے۔“ ذہن نے سنجیدگی سے دانائی سے پُر تجزیہ پیش کیا تو وہ گہری سانس بھر کر امیگریشن کی طرف بڑھ گیا۔

ایما واپس آئی تو جیسے دل شاذان کے پاس ہی چھوڑ آئی۔ اس نے جان لیا تھا کہ زندگی اپنا رُخ بدل چکی ہے۔ اب دور آسمان یا رنگ زمانہ اثر کرنے والا نہیں کہ اب ہر بات اختیار سے نکل کر جذبے کے رُخ پر بہنے لگی تھی۔



گرینی کو بہت دکھ ہوا تھا اس کے جانے کا خصوصاً ایما کو ساتھ نہ لے جانے کا مگر ایما نے اُنہیں یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ وہ دونوں گرینی کے ساتھ ورلڈ ٹور پر جائیں گے وہ بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ پتا نہیں گرینی اس کے بہلاوے میں آئی تھیں یا نہیں، تاہم خاموش ہوتے ہوئے اُنہوں نے اُسے خود سے لگا لیا تھا۔ اس نے شاذان سے بڑھ کر ان کی خدمت کی تھی اور کر رہی تھی۔

اور اس دن جب اس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ انکار نہیں کریں گی، ان سے پرائیویٹ بی اے کرنے کی اجازت مانگی تو وہ اس کی سعادت مندی پر نہال ہو گئیں۔

”ضرور بیٹا... میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹی زندگی کے ہر معاملے میں سبقت لے جانے والی ہو... تم چاہو تو میں کالج میں یا یونیورسٹی میں آنرز کے لیے تمہارا ایڈمیشن کرا دیتی ہوں۔“ وہ محبت سے بولیں تو اس کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی۔

”نہیں گرینی، میں گھر پر رہتی ہوں تو آپ کا ساتھ مجھے بہت اچھا لگتا ہے... باہر کی دُنیا تو بس واہمہ ہے۔ خوف آتا ہے مجھے اس سے۔ پہلے بھی اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں جاب کبھی نہ کرتی۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ خائف لہجے میں بولی۔

وہ بردباری سے مسکرا دیں... ”جو ہوا اچھا ہی ہوا بیٹا، اگر تم جاب نہ کرتیں تو شاید مجھے تم جیسی پیاری بہو بھی نہ ملتی۔“ اس کے لہجے سے چھلکتا اپنے ماضی میں سہی جانے والی تکالیف کا رنگ محسوس کر کے گرینی نے اس کا محض دل نہیں رکھا تھا، بلکہ وہ حقیقتاً دل سے کہہ رہی تھیں۔

”جواباً وہ اس درجے تو صافی لہجے کو سُن کر جھینپ گئی تھی۔

اور اُنہی دنوں جب وہ داخلہ ملنے پر کتابوں کے ساتھ وقت گزارنے لگی، ڈاکٹر عطیہ رحمان کی رپورٹ نے

اُسے خوشی اور حیرت سے گنگ کر دیا۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری دی تھی انہوں نے۔ کتنی ہی دیر وہ حیرت اور خوشی سے اُنہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ ”کم ان مسز شاذان ... اٹس ریلی ٹرو (یہ واقعی سچ ہے)۔“

رپورٹ اس کے سامنے رکھی تو فرط مسرت سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کی گود میں جلد ہی ایک ننھا مہمان آنے والا تھا۔

”آئی وانٹ مائی فیملی کمپلیٹ۔“ شاذان کی آواز اس کی خواہش اس کے اندر گونجی تھی۔

”تھینک یو ڈاکٹر ... آپ کو اندازہ نہیں کہ میں آج کتنی خوش ہوں۔“ وہ بے اختیار سی ہو گئی تھی۔ خوشی سے کہتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عطیہ مسکرا رہی تھیں اور پھر وہی ہوا جس کا اسے یقین تھا۔ گرینی کی خوشی کا عالم ہی جدا تھا۔ اس پر مسرت گھڑی کا اُنہوں نے سالوں انتظار کیا تھا۔ حیات ولا کی رونق دیکھنے والی تھی۔

گرینی نے اُسے جیسے بستر پر بٹھا دیا تھا۔ اللہ کا کرم اور اس کی خدمت کا صلہ تھا کہ گرینی اب اپنے کمرے سے اُٹھ کر باہر آ گئی تھیں۔ وہ جن کا سارا وقت کمرے میں گزرتا تھا اس کے ساتھ ساتھ رہنے لگی تھیں۔ شاذان کو بھی اُنہوں نے فوراً ہی فون کیا تھا، مگر اس کا سیل فون آف تھا۔ گھر پر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ لندن سے باہر گیا ہوا ہے اور پھر پورے ایک ماہ تک وہ اس کی ٹیلی فون کرتی رہیں مگر وہ نہ ملتا۔

ایما کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب اس نے خود کو مکمل محسوس کیا تھا۔ ممنا کا فطری جذبہ اس کی زندگی کی اساس بن گیا تھا۔ شاذان کا خیال ایسے میں ہر لمحے اس کے ساتھ تھا۔

جانے وہ کہاں تھا؟ وہ چاہتی تھی اُسے یہ خوشخبری سنا کر دُنیا کی سب سے بڑی خوشی دے دے۔ معلوم نہیں کیوں محبت کرنے والے اپنے محبوب کے ہر جانی پن اور جفا جو رویے کو بھول کر اس پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی خوش تھی جبکہ ڈاکٹروں نے اُسے بہت احتیاط بتائی تھی۔ گرینی ہر دس منٹ بعد فون سیٹ کے قریب بیٹھی نظر آتی تھیں۔

شاذان نے محض ایک ہی لینڈ لائن نمبر دے رکھا تھا لندن کا جس پر ریکارڈنگ لگی تھی لہذا میسج چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یوں انتظار کی صلیب ان دونوں کے کندھوں پر رکھ دی گئی۔

”حیرت ہے ایما اس نے اتنے دن تم سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ کیا وہ تمہیں فون نہیں کرتا تھا؟“

گرینی سوال کرتی تو وہ پریشان ہو جاتی۔ اٹلے سیدھے بہانے کر کے اُنہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتی جس میں کبھی کامیاب ہو بھی جاتی اور کبھی گرینی اُسے گہری نظروں سے دیکھنے لگتیں۔

”بیٹا تم خوش تو ہو؟“ وہ پوچھتیں۔ لہجے میں خدشے اور اندیشے کلبلا رہے ہوتے اور چونکہ وہ ان کی فکر جانتی تھی اس لیے اطمینان سے کہتی۔

”میں آج جتنی خوش ہوں گرینی پوری زندگی میں کبھی نہ تھی۔“

اس کے انداز و لہجے سے اطمینان و خوشی جھلکتی تھی، مگر گرینی کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی تھیں۔ ایسے میں اُسے دھڑکے لگ جاتے۔ دعا کرتی کہ جلد از جلد شاذان کا فون آ جائے اور ایسے ہی دنوں میں اچانک ایک روز اُس کا فون آ گیا۔ گرینی نے اسپیکر آن کر رکھا تھا جس کے باعث کمرے کے باہر ان دونوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گرینی اس کو سخت سست سنا رہی تھیں۔

”مجھے تو مجھے تم نے بیوی تک کو مہینے بھر سے فون نہیں کیا شاذان۔“ وہ سخت خفا ہو رہی تھیں۔ ایما خاموشی سے زیر لب مسکراتی سُنتی رہی۔

”بہت شرمندہ ہوں گرینی۔ ان فیکٹ میرا سیل فون خراب ہو گیا تھا۔ پھر ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے لندن سے باہر جانا پڑا تو شدید مصروفیت کی وجہ سے کال نہیں کر سکا۔“ اس کے سامنے غصے میں بھرا رہنے والا گرینی کے سامنے کیسے شرمندہ ہو رہا تھا۔ وضاحت دے رہا تھا۔ وہ دھیان سے سُنے لگی۔ اتنے دن بعد اس کی آواز سُن کر سماعتیں سرشار ہو رہی تھیں۔

”اچھا اب مجھے ہی مناتے جاؤ گے یا ایما سے بھی بات کرو گے؟ جانتے ہو ایک خوشخبری ہے اس کے پاس۔“ وہ خاموش ہوا تو گرینی نے خوشی سے کھٹکتے لہجے میں کہا۔

ایما کی دھڑکنیں رفتار بھولنے لگیں جبکہ شاذان کچھ متعجب رہ گیا تھا۔

”کیا مطلب گرینی... کیسی خوش خبری؟“ اس نے کچھ اُلجھ کر پوچھا تو گرینی نے اُسے بتایا۔

”واٹ... آر یو سیریس گرینی۔“

بے تحاشہ خوشی سے اس کی آواز بوجھل ہو گئی تھی۔ ایما نے فرط تشکر سے آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی ہی دیر وہ بے یقینی کا اظہار کرتا رہا اور گرینی اُسے یقین دلاتی رہیں۔

”مگر ایما...؟ کیسی ہے وہ۔“

اچانک وہ کسی گہری سوچ کے نتیجے میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ دبے دبے لہجے میں اس کا پوچھا۔

”کیسی ہوگی وہ؟ جس کا شوہر اُسے ایک ماہ تک پلٹ کر نہ پوچھے، وہ کیسی ہو سکتی ہے؟ ایما تو پھر بہت صابر بچی ہے۔“ گرینی ایک بار پھر گھر کئے والے انداز سے بولیں

”اس نے آپ سے شکایت کی ہے میری؟“ جواباً اس نے سکون سے دریافت کیا تھا۔

”لو تم اُسے ایسا سمجھتے ہو؟ وہ تو بے زبان بچی ہے... میں کچھ کہوں تو تمہاری حمایت کرتی ہے... تسلی دیتی ہے مجھے... مگر بیٹا ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“ گرینی آج مکمل ڈانٹنے کے موڈ میں تھیں۔

”ماشاء اللہ گرینی... آپ تو بالکل پہلے جیسی ہو گئی ہیں... ڈانٹ رہی ہیں آج مجھے!“ اس نے ہنس کر ٹالا تھا۔ گرینی مسکرا دیں۔



”ہاں تو تمہاری بیوی کی خدمتوں کا نتیجہ ہے یہ بھی۔ اس بچی نے اتنی خدمت کی میری۔ میری صحت کا اتنا خیال تو کبھی تمہارے بابا حیات بھی نہ رکھ سکے۔“

گرینی اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ وہ تائیداً خاموش ہو گیا تو وہ بولیں ”اچھا لو اب اس سے بات کرو... بلاتی ہوں میں اسے... ہولڈ رکھنا۔“

گرینی نے اسے آواز دی تو وہ سچ سچ قدم اٹھاتی ان کے بیڈ روم میں آ گئی۔ گرینی کی چمکتی آنکھیں اور مسکراتے لب اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ اس نے سیل فون تھام لیا تو وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ دل ایک لمحے کے لیے بڑی تیزی سے دھڑکا تھا۔

”السلام علیکم...“ اس کی غنائیہ آواز گونجی تو شاذان حیات علی کو اس کے لہجے میں چھپی بے تابیت بہت واضح محسوس ہوئی۔ وہ خود کچھ نہیں کہتی تھی، مگر اس کے آنکھیں اور اس کا لہجہ بہت کچھ بتا دیتا تھا۔

”عولیکم السلام ایما۔ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں... آپ کیسے ہیں؟“

دل تو چاہا کہ آپ کے بغیر خوش نہیں، مگر ہونٹوں تک آتے الفاظ اس نے لوٹا دیے تھے۔ ”آئی ایم آل رائیٹ... مجھے یقین نہیں آرہا کیا گرینی سچ کہہ رہی ہیں۔ از اٹ رینلی ٹرو ایما؟“ وہ اب تک بے یقین سا تھا، تاہم لہجے میں کوئی خاص مسرت نہ تھی۔

اس کے جذبے ٹھنڈے سے پڑنے لگے... بہت سست لہجے میں اس نے ”جی ہاں“ کہا۔

”بٹ یو آر ٹو ینگ ایما... ابھی تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ کیا تم ایک ایسے بچے کو پالنے کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہو جس کا فادر...“

بے اختیار شاذان کے لبوں سے سچ نکل گیا تھا... ادھورا جملہ اپنے اندر بہت معنی رکھتا تھا۔ ایما کے خون کی روانی جیسے بالکل مدہم ہو گئی۔ یہ شاذان نے کیا کہہ دیا تھا۔ اتنا شدید دھچکا... ایک لمحے کے لیے وہ بالکل گنگ رہ گئی۔

”آئی مین ایما کیا...؟“

”پلیز! اور کچھ مت کہیے گا۔“ یکدم اس نے بات تیزی سے کاٹ دی تھی۔ شاذان یکنخت خاموش ہو گیا۔

”زندگی میں جب کبھی بھی آپ نے مجھے اس گھر سے، اپنی زندگی سے نکالا، میں یہاں سے خالی ہاتھ جاؤں... یہاں آکر مجھے جو کچھ ملا، سب آپ کا تھا... سب آپ کا ہے اور سب آپ کا ہی رہے گا۔“ بھگتے لہجے پر بمشکل قابو پا کر وہ بولی تھی مگر آواز سے دکھ جھلک اٹھا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ بے اختیار گھٹنوں پر سر ٹکا کر اس نے سسکیوں کو آزاد چھوڑ دیا۔

آج اس کی آخری اُمید کا چراغ بھی بجھ گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ شاذان حیات کی تنگ دلی نے

اُسے بری طرح ضرب پہنچائی تھی۔ اس کی انا، اس کی خودداری، اس کی وفا اور اس کے ضبط پر کھلے بندوں ڈاکہ پڑا تھا۔ شاذان نے کوئی خنجر جیسے دستے تک اس کے قلب میں اُتار دیا تھا۔ اس کی آنکھیں لہو نہ روتیں تو اور کیا کرتیں۔

گرینی کتنی دیر بعد پلٹیں اور خلاف توقع منظر دیکھ کر دہل سی گئیں۔ تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ”ایما ... میری بچی ... کیا ہوا؟“

اور وہ یوں مچل کر اُن کے گلے لگی جیسے اپنے سارے آنسو ان کے کندھے پر بہا دینا چاہتی ہو۔ ”ایما بیٹا کیا ہوا جان۔“

گرینی اُسے بہت دن بعد شاذان سے بات کرنے کا اثر سمجھ رہی تھیں۔ اس کی جدائی کو ان آنسوؤں کی وجہ سے سمجھ رہی تھیں۔ ”بس میں کر رہی ہوں شانی کو فون کہ آئے اور تمہیں ساتھ لے جائے ... اس کی جدائی نے یہ حال کیا ہے تمہارا ... کیا میں سمجھتی نہیں؟“

”نہیں!“ اُنہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق بات کی تو وہ کر بنا کی سے چیخ اُٹھی۔ گرینی لمحے بھر کے لیے متوحش ہو گئیں۔ ”نہیں گرینی پلیز مجھے خود سے جدا مت کیجیے گا ... آپ مجھے خود سے علیحدہ مت کریں ... آپ ہی تو میرا ...“

بے اختیاری اور شدت دکھ سے وہ نہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی، بمشکل خود کو روکا اور سادہ لوح گرینی اس کی محبت پر جی جان سے فدا ہو گئیں۔ اُسے خود سے بے تحاشہ لپٹا لیا۔

”نہ بیٹا! میرا مقصد تمہیں خود سے دور کرنا نہیں ... میں تو بس ...“

”نہیں ... نہیں!“

وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ گرینی کچھ پریشان اور کچھ مسرور سی اُسے چپ کرا رہی تھیں۔ اس کی محبت نے اس کا سروں خون بڑھا دیا تھا۔

”بڑی عظیم ہیں وہ ماں باپ جن کی تم جیسی بیٹی تھی ... مگر اب تم میری بیٹی ہو۔“ گرینی نے اس کا ماتھا چوم لیا جو اذیت سے زرد پڑ گئی تھی۔

سودا درد میں تنہا کھڑا ہوں  
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے  
کنارا دوسرا دریا کا جیسے  
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے  
یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی  
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں  
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

پھر بہت سارے دن اسی طرح گزر گئے۔ شاذان کا فون آتا، گرینی سے بات ہو جاتی تو وہ مطمئن ہو جاتیں، تاہم ایما کو اس نے دوبارہ اس کے سیل فون پر کال کیا، مگر ایما نے ریسو کرنے کے بجائے اسے آف کر دیا۔ دکھ ایسا تھا کہ باوجود خواہش کے وہ ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غذا، دوا اور گرینی کی سخت دیکھ بھال کے باوجود وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دو ماہ اسی طرح گزر چکے تھے۔ ڈاکٹر عطیہ نے وجہ ”ڈپریشن“ بتائی تو گرینی نے شاذان کو حتمی انداز میں کہہ سنایا کہ لندن سے فوراً فلائیٹ پکڑ کر چلا آئے۔ سو اُسے آنا ہی پڑا۔

ہمیشہ کی طرح وہ اچانک آیا۔ شام کا وقت تھا۔ گرینی آرام کر رہی تھیں اور وہ لان میں بیٹھی بُنائی کرنے میں منہمک تھی کہ اس کی آہٹ پر چونکی۔ وقت کی نبض جیسے ایک لمحے کے لیے تھم گئی تھی۔

شاذان اس کے مقابل تھا۔ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح گلابی پن نہیں اُترا، نہ ہی وہ بوکھلائی تھی۔ ہاں بس ایک ٹک اُسے دیکھتی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اون کا گولا لڑھک کر شاذان کے قدموں تک پہنچ کر جاڑکا۔

کھلی کھلی شام میں اپیل گرین کرتے پر براؤن شلوار دوپٹے میں ملبوس وہ نبھی نبھی سی نظر آرہی تھی۔ چہرے پر ماضی کی نسبت زیادہ اعتماد تھا البتہ اس کا سوغوار حسن ممتا کے رنگ میں ڈوب کر اُسے اور بھی جاذب نظر بنا رہا تھا۔ شاذان نے جھک کر اون کا گولا اُٹھایا اور اس کے پاس چلا آیا تو اس نے گہری سانس بھر کر سلام میں پہل کی۔

”وعلیکم السلام! کیسی ہو؟“ وہ اس کی جھکی پلکوں پر نظر جمائے ہوئے تھا جس کے پیچھے اُسے نمی کا ایک طوفان مچلتا نظر آ رہا تھا۔  
”اچھی ہوں۔“

”وہ تو تم ہو!“ وہ قدرے مسکرا کر بولا تھا۔ اس نے جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ تیر چہرے سے عیاں تھا۔ ”مگر بہت ویک لگ رہی ہو... کیا اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے۔“

وہ اپنائیت بھرے لہجے میں نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ ایما کو لگا، اس درجہ مسرت پر وہ رو ہی پڑے گی۔ ”میں ٹھیک ہوں سر! آپ نے بہت دن بعد دیکھا ہے اس لیے شاید...“

”بہت دن بعد دیکھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ماضی میں جو کچھ گزر چکا ہے، اُسے میں بھول گیا ہوں۔ دیکھو ایما میں لندن میں رہوں یا یہاں... ہمارے بچ جو رشتہ ہے اُسے ذہن سے کمپلیٹلی تھرو آؤٹ نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ نظر کہہ رہی تھی (کیا واقعی ہمارے درمیان کوئی رشتہ

ہے یا محض میری نظروں کا دھوکہ ہے یہ۔

شاذان کی زیرک نظریں اس کا سوال سمجھ گئی، مگر نظر انداز کرنا اس کی مجبوری تھی۔

”اینی وے، اندر چلو اور ہاں ڈرائیور سے کہو ڈرائیو وے پر کچھ بیگنز رکھے ہوئے ہیں لے کر اندر آ جائے۔“ وہ اُسے کچھ جتاتے ہوئے بولا تھا، ساتھ ہی ہدایت دی تو وہ حیرت سے مڑ کر ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگی۔ آج سے پہلے وہ جب بھی آیا گیا، محض ایک بریف کیس ہاتھ میں ہوتا، مگر آج یہ سامان؟“

گرینی سو گئی تھیں۔ وہ انہیں ڈسٹرب کرنے سے منع کرتے ہوئے فریش ہونے چلا گیا تو وہ کافی بنا لائی۔ جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی، وہ بلیک شلوار قمیص میں ملبوس کھڑا بال بنا رہا تھا۔

”کافی۔“ نگ اس کی طرف بڑھایا۔

”وہاں رکھ دو۔“

شاذان نے ہدایتاً کہا تو وہ رکھ کر پلٹنے لگی۔ یقیناً اس کے آرام کے خیال سے باہر جانے کا ارادہ تھا مگر اس نے ایما کا ارادہ بھانپ کر اُسے روک لیا۔

”کیا کوئی کام ہے؟“ وہ مڑی تھی۔ سادگی سے دریافت کیا۔

شاذان نے سنجیدگی سے مڑ کر اسے دیکھا تھا جس کی آنکھوں میں اُمید کا کوئی جگنو نہیں چمک رہا تھا۔ نہ جانے اس کی نظروں میں کیا تھا، وہ نگاہ چرا گئی۔ چہرے پر ندامت کا رنگ اُتر آیا۔

”دیکھو ایما اس طرح غیریت کا ثبوت دے کر تم مجھ سے بدلہ یا انتقام تو لے سکتی ہو، مگر اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں ... تمہیں خوش رہنا چاہیے۔ گرینی نے بتایا ڈاکٹر نے تمہیں ”ڈپریشن“ بتایا ہے۔“ سینے پر بازو لپیٹے وہ وارڈ روب سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”تو آپ کیا گرینی کے کہنے پر آئے ہیں؟“

اس کی بات کے جواب میں اس نے اچانک ہی نظر اٹھائی تھی۔ شاذان بے ساختہ مسکرا کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ اس کا رخ ہاتھ تھامتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

”آپ کافی لمبا سفر کر کے آئے ہیں، آرام کریں۔“

اس بار اس نے بہت سہولت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اعتماد سے کہا تھا۔ شاذان کچھ متعجب سا رہ گیا۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھانے لگی تو اس نے خود آگے بڑھ کر روک لیا۔

”یہاں بیٹھو ... میں کچھ لایا ہوں تمہارے لیے اور جونیئر کے لیے۔“ ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اس نے سادگی سے کہا تو ایما کو رُکنا ہی پڑا۔

شاذان نے اُسے صوفے پر بٹھا کر ایک کے بعد ایک بیگ کھولنا شروع کیا۔ بچوں کے لاتعداد کپڑے اور کھلونوں سمیت اس کے لیے بھی پیش قیمت تحائف تھے۔ وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

بچے کے کپڑے کچھ تو اتنے بڑے تھے کہ چار سال بعد ہی پہننے میں آتے۔ ایما کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”کیا ہوا... کیا کچھ غلط لے آیا۔“

ایک ایک چیز وہ بے حد چاؤ سے دکھا رہا تھا۔ ایما کے دل پر چھایا غبار چھٹنے لگا تھا۔ آنکھوں کے جگنو چمکنے لگے۔ چہرے پر رنگ اُتر آئے۔ اُسے مادی چیزوں کی چاہ نہیں تھی۔ مگر شاذان کا یوں اپنی آمدگی کے ساتھ اس معاملے میں دلچسپی لینا اُس کے دل و دماغ میں پھول سے کھلا گیا۔

”ان میں چند کپڑے اور کھلونے تو کافی بڑے ہیں سر۔ یہ تو دو تین سال تک کا سامان لے آئے ہیں آپ۔“ اس کے سوال کرنے پر اس نے مسکراہٹ سمیٹ لی تھی۔

شاذان ہلکا سا قہقہہ لگا کر اس کے پہلو میں آ بیٹھا ”مجھے یہ سب چیزیں خریدنے کا سینس نہیں ایما... جو مجھے اچھا لگتا گیا، میں خریدتا گیا۔ یونو میں نے اپنے بچے کا امیج کیسا بنایا ہے بالکل اپنے جیسا۔ اسمارٹ، کانفڈنٹ اور انٹیلی جینٹ، مگر اسے تمہاری طرح انوسنٹ اور لونگ (Loving) بھی ہونا چاہیے... مجھے نہیں معلوم بیٹا ہوگا یا بیٹی اس لیے میں نے ہر طرح کے کپڑے اور ٹوائز لیے ہیں۔“

ایسے بے اختیاری، ایسی محبت اس نے شاذان کی آنکھوں میں پہلی بار دیکھی تھی، وہ دم بخود رہ گئی اور پھر وہ بہت دیر اس سے اپنے خواب اور خواہشوں کے بارے میں بات کرتا رہا۔ اپنے بچوں کے متعلق اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ ایما کو اندازہ ہوا کہ اپنے رویے اور اپنے اُس ادھورے جملے پر وہ بے حد نادم تھا۔

اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اس کے زخم مندمل کرنے آیا ہے۔ اس نے بہت دور تک کی پلاننگ کر رکھی تھی، مگر اس پلاننگ میں اس کے بچے شامل تھے، مگر ایما کہیں نہیں تھی۔

تاہم اس کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ شاذان نے خواہ اُسے دل سے قبول کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر اس ننھے مہمان کے استقبال کے لیے وہ دل و جان سے تیار تھا۔

گرینی نے اُسے حسبِ توقع بے حد لتاڑا تھا۔ اور وہ اُنہیں مناتا ہنستا مسکراتا رہا۔

اس بار ایما نے اس کا بالکل نیا روپ دیکھا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اسے اپنے بچے سے بے حد محبت تھی۔

ایما کی صحت کے لیے اس نے اس کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر عطیہ کے یہاں بھی گیا۔

”آپ کی مسز اینیمک (Aneamic) ہیں... ساتھ ہی غالباً آپ کی غیر موجودگی بھی ان کو افیکٹ کرتی ہے... آپ ان کا خیال رکھیں۔“

ڈاکٹر عطیہ نے اُسے ہدایت کی تو وہ لب بھینچ کر مکمل تعاون کا یقین دلاتا رہا۔ بقیہ دن اس کا رویہ اتنا

مریانیہ اور حلاوت آمیز رہا کہ ایما کو اپنے دکھ بھولنے لگے اور گرینی کی شکایت بھی دور ہو گئی۔ یوں ٹھیک بیس دن بعد وہ ایک بار پھر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

نہ اداس ہوں نہ قرار ہے میری کیفیت اک چراغ سی  
وہ چلے گئے تو میں بجھ گیا جو وہ آگئے تو میں جل اٹھا  
گزرتے وقت کو کون روک سکا ہے؟ اس کے لیے شاذان بھی اچھے وقت کی طرح تھا جو جتنی دیر سے آتا،  
اتنی ہی جلدی چلا بھی جاتا تھا۔

ہر دو ماہ بعد وہ آتا اور کچھ عرصے بعد جانے کو پر تو لگتا تو ایما کے اندر دراڑیں پڑنے لگتیں۔ یہ احساس  
حاوی ہونے لگتا کہ کچھ بھی ہو، شاذان کر سٹینا کے بغیر نہیں رہ سکتا۔  
کر سٹینا اس کی اولین چاہت ہے، اُسے بھلا ناممکن ہوگا۔

جبکہ وہ اس سے ایک ایسے رشتے میں منسلک ہے جس کو اس نے مجبوراً بنایا اور نبھایا ہے۔ اور انہیں دنوں  
جب وہ اپنی کے اس رویے کے لیے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ بارگاہ ایزدی میں اس کی دعا قبول ہوئی اور  
ایک خوبصورت صبح اس کے لیے بیٹے کی نوید لائی۔

کتنی ہی دیر وہ اس گل گو تھنے سے فرشتے کو بازوؤں میں لیے دیکھتی رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس  
کے وجود کا حصہ ہے۔ ننھا سا، صحت مند بچہ اس کی گود میں کلکاریاں مارنے لگا تو بے اختیار اس نے اس کا ماتھا چوم  
لیا۔ دو آنسو شکر کے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

گرینی اس کے ساتھ تھیں۔ اس کی طرح گرینی بھی اس قدر مسرور تھیں کہ سوچ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔  
احتشام اور ثنا بھابھی سمیت ڈھیر سارے لوگ اسپتال چلے آئے تھے، مگر جسے آنا تھا جس کی آہٹ کی وہ منتظر  
تھی، وہ نہ آ سکا۔ پورا دن انتظار میں گزر گیا۔

اس کی خوشی کا رنگ مدھم ہونے لگا۔ گرینی خود پریشان تھیں، مگر اسے بہلاتی رہیں۔ ثنا بھابھی بھی اس کے  
ساتھ ساتھ تھیں۔ اس کی شاکی نظریں بار بار احتشام کی طرف اٹھیں۔

”وہ آجائے گا بھابھی ... ممکن ہے کہ آنے کی تیاری ہی کر رہا ہو۔“

ہر بار وہ تسلی دیتا، مگر اس کے دل کو جیسے پکھے لگ گئے تھے۔ بیتابی سے وہ اس کی منتظر تھی۔ دوسرا دن بھی  
اسی طرح گزر گیا حتیٰ کہ تیسرا بھی۔ سب مایوس ہو گئے۔

چوتھے دن اس کا فون آیا تو جیسے سب کی جان میں جان آئی۔ بیٹے کی خبر پا کر وہ اسی طرح خوش ہوا جیسا  
اُسے ہونا چاہیے تھا، تاہم آنے کے بارے میں اس نے عذر پیش کر دیا تھا۔

”میرا فی الحال پاکستان آنا ممکن نہیں گرینی ... میں یہاں ایک کیس کی وجہ سے اگلے چھ ماہ تک لندن سے باہر نہیں جا سکتا۔“ اس نے کسی کیس کا ذکر کیا تو تو گرینی کا دل دہل گیا۔

”کیا ... کون سا کیس؟“

”کم آن گرینی ... آپ پریشان مت ہوں ... میرے آفس کے ورکر کا کیس ہے۔ ہماری فرم کو انوالو کر لیا گیا ہے ... بٹ ڈونٹ وری ویسے کوئی مسئلہ نہیں۔“

”اس نے اطمینان سے بتایا، مگر گرینی کو تسلی نہ ہو سکی، چنانچہ اسے کافی دیر دلاسہ دینا پڑا تھا۔ ایما سے بات ہوئی تو وہ چھ ماہ کا سُن کر بالکل چپ ہو گئی۔

یہی تو وہ وقت تھا جس کے انتظار میں اس نے طویل سفر کیا تھا، مگر اس مقام پر پہنچ کر بھی وہ خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ شاذان نے اُسے بے حد مبارک باد دی تھی۔ بیٹے کو دیکھنے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی، مگر حقیقتاً اُسے اُس شاذان سے جو پچھلے چند مہینوں سے اس کا بہت خیال رکھنے لگا تھا، آج کا شاذان بہت مختلف تھا۔

”میں چھ ماہ بعد آؤں گا ... ڈونٹ وری سب ٹھیک ہو جائے گا ... بس جو نیئر کا بے حد خیال رکھنا ... آئی وائٹ ٹوسی ہم پرفیکٹ لائک می۔“

آخر میں اس نے اپنے پہلے جیسے انداز میں کہا تو وہ بمشکل سب لوگوں کے سامنے ضبط کرسکی، مگر جونہی تنہائی ملی، وہ اپنے بیٹے کو گلے سے لگا کر رو پڑی۔

اب سمجھ میں آیا کہ یہ کرم نوازی صرف اس لیے تھی کہ کہیں اس کی ذہنی الجھنوں اور جسمانی کمزوری کا اثر بچے پر نہ پڑے۔ یہ یقیناً گرینی کی ذات کی خاطر کیا گیا تھا۔

”کبھی گرینی کے لیے تو کبھی بیٹے کی خاطر آخر کب تک یہ شخص میرا استحصال کرتا رہے گا۔ مری جگہ کہاں ہے یا رب العالمین؟ شاذان کی زندگی میں کیا ہے میری حیثیت؟“ اس کا دل چلا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے:

کتنا سہل جانا تھا

خوشبوؤں کو چھو لینا

بارشوں کے موسم میں شام کا ہر اک منظر گھر میں قید کر لینا

روشنی ستاروں کی

مٹھیوں میں بھر لینا

کتنا سہل جانا تھا

خوشبوؤں کو چھو لینا

جگنوؤں سی باتوں سے  
پھول جیسے آنگن میں  
روشنی سی کر لینا  
اس کی یاد کا چہرہ، خوابناک آنکھوں میں  
جھیل کے گلابوں پر دیر تک سجا لینا  
کتنا سہل جانا تھا  
اے دل کی خوش فہمی  
اس طرح نہیں ہوتا  
تنتلیاں پکڑنے کو دور جانا پڑتا ہے  
اس طرح نہیں ہوتا  
اس طرح نہیں ہوتا.....

بیٹے کا نام اعیان رکھا گیا تھا۔ گرینی روزانہ شاذان کو اعیان کی تصویر اور ویڈیو بھجواتی تھیں۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ درحقیقت اعیان کی صورت دیکھ کر وہ بھی جینے لگی تھی ورنہ اس آخری دھچکے نے اُسے شاذان سے بہت دور کر دیا تھا۔

گرینی کبھی کبھی اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر دہل سی جاتی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں جذبوں کی ویرانی بہت واضح نظر آنے لگی تھی۔ وہ خود ایک عورت تھیں، ایک بیوی رہ چکی تھیں۔ اس کی دلی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔

مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شاذان کو فون کرتیں تو وہ خود اتنا پریشان محسوس ہوتا کہ اس سے بھی کچھ نہ کہہ پاتیں۔ ایمانے تو خیر چپ ہی سادھ لی تھی۔ شاذان فون کرتا تو ہوں ہاں کرتی رہتی۔ کہنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ اسی طرح کرتے کرتے چھ ماہ گزر گئے، مگر اس کی واپسی پھر بھی نہ ہو سکی۔ اب تو گرینی بھی متوحش ہو گئیں۔ تنگ آ کر اُنہوں نے اس کے فون اٹینڈ کرنے ہی چھوڑ دیے۔

احتشام اور ثنا الگ پریشان تھیں۔ گرینی اُنہیں ہی بلاتیں اور اُسے سمجھانے کو کہتیں۔ احتشام کے لیے ایما کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ گو کہ اب تو وہ اُسے شاکی نظروں سے بھی نہ دیکھتی کہ اس کے چہرے پر لکھی ندامت اُسے متاسف ہی کرتی تھی، مگر اس کے چہرے کی زرد رنگت اور جھکی ہوئی بھیگی پلکیں احتشام کے دل کو کچوکے لگاتیں۔

تنگ آ کر احتشام نے اُسے فون کیا تو اس نے واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ مجبوری ہے، آ نہیں سکتا۔



ایمانے سمجھا تھا اولاد کی زنجیر اُسے یہاں باندھ کر کھینچ لائے گی مگر شاذان نے اس کی ہر اُمید، ہر توقع، عبث کر ڈالی تھی۔ کبھی کبھی اعیان کو گلے سے لگا کر وہ بے آواز روتی جاتی تو وہ ماں کو حیرت سے ٹکڑ ٹکڑ دیکھنے لگتا۔

گرینی کے لیے شاذان کا یہ رویہ کچھ صحیح نہیں رہا اور ایک بار پھر ان طبیعت خراب ہو گئی۔ فوری طور پر اسپتال جانا پڑا۔ جہاں بائی پاس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ پا کر احتشام نے ایما کو باخبر کرتے ہوئے آپریشن کے انتظامات کر ڈالے۔

بڑا کڑا وقت تھا۔ شاذان کی غیر موجودگی میں یہ سب یوں ہو گیا تھا۔

ایما اعیان کو کندھے سے لگائے عالم پریشانی میں اسپتال سے گھر اور گھر سے اسپتال کے چکر لگا رہی تھی۔ شاذان کو اطلاع کرنے سے احتشام نے روک دیا تھا۔

آپریشن ناگزیر تھا۔ وقت کا لمحہ لمحہ سسک سسک کر گزر رہا تھا۔ تب کہیں جا کر ڈاکٹر بلگرامی نے باہر نکل کر خوشی کی خبر سنائی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ گرینی ٹھیک ہیں تو وہ سجدے میں گر پڑی۔ شاذان نے گرینی کی ذمہ داری اُسے سونپی تھی اللہ نے اس کی دعائیں سُن لی تھیں۔

پھر پورا ہفتہ بے حد تیزی سے گزرا۔ گرینی کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو انہیں روم میں شفٹ کر دیا گیا۔ ایما نے جی جان سے اُن کی خدمت کی تھی۔ پھپھو اور عینی بھی انہیں دیکھنے آئیں۔

زندگی ایک ایسے موڑ پر آگئی تھی کہ اسے سوائے تقدیر کے کسی سے شکوہ نہ رہا تھا۔



اس روز بھی وہ نماز پڑھ کر گرینی کی صحت اور اعیان کے لیے دعا مانگ رہی تھی تو آنسو نکل آئے۔ اب اس کی دعاؤں کا مرکز یہی دونوں تھے، جبکہ شاذان کی خیریت کی دعا تو جیسے اس کی سانس سے بندھ گئی تھی۔

رنجور ہے ملول ہے شوریدہ حال ہے  
جو بھی وبال ہے ترے غم کا کمال ہے  
آواز دے کے کس کو بلائیں اے دوستو  
جو جا چکا ہے اس کا پلٹنا محال ہے

سفید کاٹن کے کرتے شلوار میں ملبوس کلف لگے دوپٹے کو سلیقے سے سر پر جمائے اس کا پورا وجود کسی نورانی ہالے میں محصور لگ رہا تھا۔

دروازے سے اندر آتے شاذان کے قدم ٹھٹک گئے۔ نظریں مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔ قدم پیچھے ہٹ گئے، حتیٰ کہ وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر آنسو صاف کرتی اُٹھ گئی۔ سامنے ہی بیڈ پر گرینی آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ وہ اُٹھ کر سیدھی اُن کے پاس گئی۔ اعیان کو گود میں لے کر گرینی کے پاس آ بیٹھی۔

”لیجیے گرینی! سوپ لے لیجیے۔“

اس کا سنجیدہ لہجہ اور حلاوت سے بھرپور آواز شاذان کی سماعتوں کا حصہ بن گئی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود وہ کس تندہی سے ان کی خدمتیں انجام دے رہی تھی۔

گرینی نے آنکھیں کھولیں تو اعیان لپک کر ان کے پاس جانے لگا۔ ایما نے اُسے سرزنش کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ منظر اس قدر مکمل اور خوبصورت تھا کہ ان دونوں کو اس کی آمد کا اندازہ تک نہ ہوا۔ وہ اس طرح کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ اُن کی نظر بھی نہ پڑے، مگر زیادہ دیر ضبط نہ کر سکا۔

گرینی کا سوپ ختم ہونے سے پہلے ہی وہ بیتابی سے اندر چلا آیا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ چونکی تھیں۔ ایما کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر سوپ میں گر پڑا۔

”میں آگیا گرینی! دیکھیے میں آگیا۔ میں آپ کو لینے آگیا ہوں۔“ وہ بے قراری سے آگے بڑھا تو باوجود لاتعداد شکایتوں کے گرینی کے خفیف بازو اس کے لیے وا ہو گئے۔ اُنہوں نے اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔ ایما غیر محسوس انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں چلا گیا تھا تو میرے بچے اپنی گرینی کے بڑھاپے تک کا خیال نہیں آیا تھے۔“

گرینی کے آنسو بہنے لگے تھے ... شاذان کو احساس ہوا تو اُنہیں خود سے الگ کیا۔

ابھی ابھی احتشام اور ڈاکٹر بلگرامی سے مل کر آیا تھا۔ احتشام نے تو وہ جھاڑا تھا کہ سخت ندامت اور پریشانی کے باعث اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

”میں یہیں تھا آپ کے پاس بس اپنی ذاتی الجھنوں میں پھنس گیا تھا ... اپنی وے فرسٹ ٹیل می آپ کیسی

ہیں؟ یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے اپنی ... میرے ساتھ چلئے میں آپ کو لے جانے آیا ہوں۔“

”میں انسان ہوں بیٹا اور وہ بھی بے صبر ... ایما کی طرح سمجھا تھا تم نے مجھے کہ اتنی ہمت دکھاؤں گی ... یہ

تو بس اس کا دل گردہ ہے جو تمہاری نالائقیوں اور بے اعتمادلیاں برداشت کرتی جا رہی ہے۔“

نجیف اور نقاہت زدہ آواز میں بھی وہ اُسے ڈانٹ رہی تھیں۔ چہرے کے تاثرات کافی تند تھے۔ ایما سر جھا کر پیچھے سرک گئی۔ شاذان نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی مگر اعیان نے ساری توجہ کھینچ لی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو، تمہارا بیٹا ہے آگے بڑھ کر تھام لو اُسے۔“ دل نے بڑی شدت سے خواہش ظاہر کی

تھی تو وہ نہ رہ سکا۔ بے قراری سے آگے بڑھا تو ایما نے اپنی گرفت اعیان پر سے ڈھیلی کر دی۔

اگلے لمحے وہ اس کی گود میں تھا، مگر لپک لپک کر ماں کی طرف آ رہا تھا۔

”مائی سن ... یو آر مائن جسٹ مائن ...“ میرے بیٹے تم میرے ہو صرف میرے ...

مچلتے پھسلتے اعیان کے چہرے کو بے تحاشہ چومتے ہوئے وہ بے خودی میں بڑبڑایا تھا۔ یہ کیسا حسین تحفہ دیا تھا

اُسے ایما نے۔ اتنی محبت، اتنی شفقت آج تک اس نے اپنے اندر مچلتی محسوس نہ کی تھی جیسی کہ آج اس کے دل سے اُبھر رہی تھی۔ برسوں کی تشنہ خواہش آج سیراب ہوئی تھی۔

گرینی اُسے مسکرا کر اور ایما ایک خاموش حصار میں کھڑی ایک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی۔ اعیان اس درجہ محبت کے مظاہرے پر احتجاجاً رو پڑا تھا۔ ایما کی طرف بانہیں پھیلا رہا تھا۔ ”نومائی ڈیر! آج نہیں ... آج تو تم صرف اپنے پاپا کے پاس رہو گے۔“

شاذان نے بیٹے کو خود سے لپٹا لیا تو نہ جانے ایما کو کیا ہوا، وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ گرینی شاذان کی طرف متوجہ تھیں جو اعیان کو پا کر دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ کبھی اُسے گدگداتا تو کبھی سینے سے بھینچ کر آنکھیں بند کر لیتا۔

”گرینی آئی کانٹ بلیو دیٹ دس آنجل از مائن۔“ (گرینی مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ ننھا فرشتہ میرا ہے)

اس کے بے یقینی سے کہنے پر گرینی بردباری سے ہنس پڑیں۔

”یہ تمہارا ہی ہے میرے بچے ... ماشاء اللہ سات ماہ کا ہونے والا ہے، مگر سال بھر کا لگتا ہے۔ ایما نے بڑی جان ماری ہے اس کے اور میرے لیے ... یقین کرو بیٹا کبھی کبھی تو لگاتار چھتیس چھتیس گھنٹے جاگے ہے وہ بچی۔“

وہ بتا رہی تھیں۔ اعیان ان کی طرف لپکا تو شاذان سنجیدگی سے اُن کی طرف متوجہ ہو کر ان کے پاس چلا

آیا۔

”پچھلے ماہ یہ بیمار ہو گیا تھا ... تم ماں کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتے ... پہروں وہ اس کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی، پھر دوسری طرف میرا بی بی ہائی ... میرا دوا، پرہیزی کھانا، مجھے کمپنی دینا ... بچی نے کیا کیا نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم اس کی قرض اُتارنا بھی چاہو تو نہیں اُتار سکتے۔ بہت احسان کیے ہیں اس نے تم پر ...“

گرینی ایک بار پھر اس کی کچھلی زیادتیاں یاد کر کے آزرده ہو گئی تھیں۔

”جس طرح تم نے اُسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا، کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنے حسن اور وقت کو بے وفا شوہر کے انتظار میں ضائع نہ کرتی۔ میں بوڑھی عورت بھلا کہاں تک روک سکتی تھی اس کو؟“ گرینی کے لہجے میں تجربے کی گہرائی تھی۔

”جن معاشی حالات میں رہ کر وہ یہاں آئی تھی، اس چکا چونند سے تو اس کی آنکھیں چندھیا جانی چاہیے تھیں، مگر اُسے تو جیسے روپے پیسے سے غرض ہی نہ ہے۔ اس سوا سال میں اس نے محض اعیان کے لیے خریداری کی اور بس۔ اسپتال اور احتشام کے گھر کے علاوہ کبھی باہر نہیں نکلی۔“

گرینی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ وہ سر جھکائے سُنتا رہا۔ اعیان اب گرینی کی گود تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

”میں جانتا ہوں گرینی ... شی از آ ویری نائس گرل۔“ اس نے مرعوب سے لہجے میں اعتراف کیا تھا۔  
 گرینی نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔ ”تو پھر اس بھلی مانس لڑکی سے کس بات کا انتقام لیا ہے تم نے شانی۔  
 کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟ کیسے کیسے دکھ نہیں دیے تم نے اُسے۔“ گرینی انتہائی دل گرفتگی سے کہہ رہی تھیں۔  
 ”پہلے میں سمجھ نہیں سکی، مگر اب اندازہ ہوتا ہے تمہیں اس سے محبت ہی نہیں تھی ... جبھی اُسے چھوڑ چھوڑ کر  
 چلے جاتے تھے ... تم نے سوچا وہ غریب گھر کی لڑکی ہے، پیچھے نہ میکے کا مان ہے نہ خاندان کی پشت پناہی ... تم جو  
 بھی رویہ رکھو گے، وہ سہتی چلی جائے گی ... تم درحقیقت اُسے میرے لیے نرس اور اپنے گھر کے لیے ایک منتظم اعلیٰ بنا  
 کر لائے تھے۔“

گرینی تو جیسے اُسے پڑھتی ہی چلی گئی تھیں۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ تڑپ کر اس نے سر اٹھایا۔ ”پلیز  
 گرینی! ایسی بات نہیں ... میں نے اسے ایکسپلاٹ نہیں کیا ... جو کچھ ہوا، وہ مجبوری تھی۔“  
 وہ آزر دگی اور شکستگی سے کہہ رہا تھا، مگر گرینی کا سویا ہوا جلال جاگ اُٹھا تھا ”تو ٹھیک ہے میری بھی ایک  
 مجبوری ہے، میں نے ایما کو اپنی بیٹی محض کہا ہی نہیں، سمجھا بھی ہے اور اسی ناطے سے میں تم سے فیصلہ کرنے کو کہہ  
 رہی ہوں ... اگر تم اسے اسی طرح آس و انتظار کی صلیب پر لٹکانا چاہتے ہو تو اُسے آزاد کر دو۔“  
 آخری جملہ کہتے ہوئے گرینی کی آنکھیں جھلک اُٹھی تھیں۔

شاذا کو یوں لگا جیسے کوئی اسے دھیرے دھیرے ڈھیروں مٹی تلے دباتا جا رہا ہے۔ بے تحاشہ گھٹن کا احساس  
 ہوا تو اس نے فرطِ ندامت سے ان کے گھٹے پکڑ لیے۔  
 ”پلیز گرینی! مجھے معاف کر دیں ... میں آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا ... رہ گئی ایما تو اس کو میں خود منا  
 لوں گا۔ بس آپ مجھ سے نہ روٹھیں۔“  
 فرطِ ضبط سے اُس کی آنکھیں سرخ ڈوروں سے بھر گئی تھیں۔ لہجے سے تاسف اور پشیمانی عیاں تھی۔ گرینی  
 کے دل کو قرار آنے لگا تھا۔

”تو پھر جاؤ ... اُسے مناؤ ... جاؤ ... وہ یقیناً گھر چلی گئی ہے۔“  
 کچھ سختی سے انہوں نے اسے حتمی اور حاکمانہ لہجے میں کہا تو اُسے اُٹھنا ہی پڑا۔  
 باہر نکل کر تلاش تو وہ واقعی موجود نہیں تھی۔ گرینی کا خیال درست تھا۔  
 ڈرائیور اور گاڑی چھوڑ کر غالباً وہ ٹیکسی سے چلی گئی تھی۔ شاذان ڈرائیور کو وہیں چھوڑ کر خود ڈرائیو کرتا ہوا گھر  
 پہنچا تو واچ میں نے بتایا کہ وہ گھر آ چکی ہے۔

اس کی سانسیں بحال ہو گئیں۔ ذہن میں عجیب عجیب سے وسوسے آنے لگے تھے ... اُن سے نجات ملی۔ تو وہ  
 اوپر اپنے روم میں آیا، جہاں حسبِ توقع وہ مل گئی تھی۔ بے تحاشہ آنسو بہاتی وہ کندھے پر شولڈر بیگ لٹکائے باہر ہی

نکلنے کو تھی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ اس کی اچانک آمد اور غیر متوقع سوال کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ گھر سے جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ لہو رنگ آنکھوں سے اس نے شاذان کی طرف گلہ آمیز نظروں سمیت دیکھا۔

”جہاں مجھے چلے جانا چاہیے۔“ آنسوؤں سے بھگتے لہجے میں اس نے بمشکل کہا تھا۔

”واٹ نان سینس ... ہاؤ کین یو ڈو دِس ... (What Non-sense ... how can you do this)۔“

شاذان کا لہجہ یکدم تلخی سے اٹ گیا تھا۔ ایمان نے بے حد شاک کی انداز میں اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔

”کیوں؟ کیوں نہیں میں کر سکتی ایسا۔ کیا صرف آپ مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟“ یکدم وہ پھر کر پوچھنے لگی تھی۔ شاذان لا جواب سا اسے دیکھنے لگا۔

”مجھے پرپوز کرنے سے پہلے جب آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ کیا میں نرسنگ اور ہوم مینجمنٹ کر سکتی ہوں ... مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا کہ مجھے یہاں بھی ملازمت ہی کرنی ہوگی ... اور وہ میں نے پوری ایمانداری سے کی۔“ بے تحاشہ روتے ہوئے وہ کہے جا رہی تھی۔ شاذان لب بھینچ کر چپ چاپ اُسے سننے لگا جس کا غبار نکل جانے دینا ہی بہتر تھا۔

”ہر طرح سے کوشش کی کہ آپ کے گھر کو اپنا گھر، اپنی آخری منزل بنالوں، مگر ایسا نہیں ہو سکا ... یہ میرے لیے ایک سرائے، ایک جائے پناہ ہی رہی، مگر میں آپ سے اس کی کوئی شکایت نہیں کر رہی ... میں جانتی ہوں آپ کر سٹینا کو چاہتے ہیں، وہی آپ کی اولین محبت ہے اور میں ... میں تو بس ایک سمجھوتہ، ایک ضرورت ایک بزنس ڈیلنگ تھی۔“

کرتے کی آستنیوں سے گال صاف کرتے ہوئے آج وہ اس کے سامنے پہلی بار اس طرح نڈر ہو کر بولے جا رہی تھی۔ شاذان کے سنجیدہ چہرے پر بے اختیار تبسم آٹھرا۔

اس لمحے وہ اسے بالکل ایک بیوقوف سی اسکول گرل لگی جو روتے ہوئے ارد گرد کا ہوش بھلا بیٹھی تھی۔ غور سے دیکھا تو اعیان کی پیدائش کا اس پر کوئی خاص اثر نظر نہ آیا، بلکہ وہ تو پہلے سے بھی دہلی ہو گئی تھی۔

”آپ گرینی کو لے جانے آئے ہیں تو یقیناً اعیان کو بھی ساتھ لے جائیں گے ... اس سے پہلے کہ آپ مجھے چھوڑ جائیں، میں یہاں سے خالی ہاتھ جا رہی ہوں ... دیکھ لیجیے اس بیگ میں صرف چند تصاویر ہیں اور اعیان کے کچھ کپڑے جو ...“ اور اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کر پاتی بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

جس پر شاذان کی مسکراہٹ سنجیدگی میں بدل گئی۔

”ایمان۔۔۔“

”پلیز مجھے جانے دیجیے سر...!“ وہ سسکنے لگی تھی۔

”تم چلی گئیں تو اعیان کا کیا ہوگا؟“

بڑے گھمبیر لہجے میں اس کے کان کے قریب سرگوشی کی گئی تو اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا

”تو اب آپ کو اعیان کے لیے ایک گورنس چاہیے۔“

لہجے میں کانچ کی کرچیاں چبھی ہوئی تھیں۔ شاذان کے ماتھے پر لمحے بھر کے لیے شکنوں کا جال سا بچھ گیا۔

”میرا خیال ہے ایما کہ میرے پاس اتنا بینک بیلنس ضرور موجود ہے کہ اعیان کے لیے گورنسز کی پوری

بٹالین کھڑی کر سکتا ہوں۔“ قدرے غصے میں اس نے کہا تھا۔

ایما کا دل ایک لمحے کے لیے حسبِ عادت بری طرح سہا، مگر پھر اس نے خود کو کمپوز کر لیا ”ہاں، مگر کیا کوئی

میری طرح مفت کی چاکری کرنے پر تیار ہوگا!“

”ایما... اسٹاپ اٹ... ہوش میں رہ کر بات کرو۔“

اب کے وہ سراپا آتش فشاں بن گیا تھا۔ ایما کی جان ہوا ہونے لگی۔ ”میں برداشت کر رہا ہوں تو تم بڑھتی

جا رہی ہو... تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری مرضی کے بغیر تم یہاں سے نکل سکتی ہو... بولو؟“

اس کے سخت لہجے پر ایما کے بہتے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

”پلیز سر! میں اور نہیں سہہ سکتی... آپ کی خاطر میں نے اپنی انا، اپنی خودداری، اپنی عزت نفس سب کچھ

داؤ پر لگا دیا، مگر پھر بھی آپ کے لیے دل میں جگہ نہیں پاسکی کیونکہ محبت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی اور ان دو

انتہاؤں کے درمیان کچھ نہیں ہوتا۔“

اس کا متورم لہجہ شاذان کو پشیمانی کے سمندر میں غرق کرتا چلا گیا۔

”میری خدمتیں آپ کی توجہ تو شاید جیت لیں، لیکن دل کبھی نہ جیت سکیں گی... یہ جان لیا ہے میں نے۔“

شاذان اس کے تجربے کی گہرائی سے کہی گئی بات پر لاجواب سا ہو گیا۔ اس چھٹانک بھر لڑکی نے اس کے

احساسات کا بہترین خلاصہ، بہترین تشریح پیش کر دی تھی۔

”اس لیے میرا جانا بہت ضروری ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں جاؤں گی تبھی آپ یہاں کرسٹینا کو لاسکیں

گے۔ اعیان کے ہوتے ہوئے آپ کو اس سے بھی کوئی شکایت نہیں ہوگی کیونکہ آپ کو اپنی محبتیں اور جائیداد کا وارث

مل گیا ہے۔ اب میری یہاں ضرورت نہیں۔“

اس نے آنسو صاف کر کے حتمی لہجے میں کہا تو شاذان نے بے حد غور سے اس کی طرف دیکھا۔

یہ اعتماد... یہ انداز یہ تجزیاتی نکتہ بین نظریں اس نے کہاں سے حاصل کی تھیں؟ شاذان متاثر و مرعوب ہونے

کے ساتھ ساتھ متعجب بھی تھا۔

ایمانے اُسے یوں خاموش دیکھا تو دروازے کی طرف بڑھی، مگر اس سے پہلے کہ ایک بھی قدم اٹھاتی، شاذان اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”جاتے جاتے ساری دفنائیں لگا گئیں مجھ پر ... مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دوگی؟۔ وہ راستے میں دیوار بنا کھڑا استفسار کر رہا تھا۔

”بڑے سے بڑے مجرم کو بھی اپنی صفائی میں بیان دینے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تمہاری عدالت تو اس سے بھی سخت ہے۔“ سینے پر بازو لپیٹے ہوئے وہ بے حد نروس کر دینے والے انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے بولا تو اُسے اپنی سماعتوں پر دھوکے کا گمان ہوا۔

”پہلے یہاں بیٹھ کر وہ سب سُن لو جو میں کہنا چاہتا ہوں، پھر چلی جانا۔“ نرمی سے ہاتھ تھام کر وہ اُسے صوفے تک لے آیا تھا۔ وہ سراسیمہ اور متوحش سی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند ثنائے وہ جیسے الفاظ تلاش کرتا رہا اور جب بولا تو لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔

”یہ سچ ہے کہ میں نے کرسٹینا کو دل سے چاہا، اُسے اپنایا اور اس کی ہر بات، ہر من مانی سہی ... جس کے نتیجے میں وہ مجھے رگیدتی چلی گئی۔“ لب کاٹتے ہوئے اس نے جیسے بڑے ضبط سے کہا تھا۔

ایمانا عالم استعجاب میں گھری اُسے سُن رہی تھی۔ آج پہلی بار اس سے اس نے کرسٹینا کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ انگلیاں مسلنے، لب کاٹنے لگی۔

”یہاں تک کہ اس نے میری اولاد کو بھی اس دنیا میں آنے نہ دیا، اسے قتل کر ڈالا تھا ... اور بس وہیں مجھے احساس ہوا کہ میں اور کرسٹینا زیادہ دور ساتھ نہیں چل سکتے ... میں نے اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالیاں برداشت کیں، مگر اس نے اُسے میری کمزوری سمجھا ... شاید ہم خود سے محبت کرنے والوں کو اسی طرح For granted لینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔“

استہزائیہ سا کہہ کر وہ خود پر ہنسا تو وہ لب بھیج کر رہ گئی۔ اشارہ اس کی طرف بھی تھا۔

”جیسے میں نے تمہارے ساتھ کیا مگر بلیومی ایما ... تمہاری شخصیت اور ہر اچھی عادت نے جیسے دھیرے دھیرے مجھے فتح کرنا شروع کر دیا۔ آئی ڈونٹ نوکب سے یہ سلسلہ چل پڑا۔“ وہ اب خود میں گم خود فراموشی کے عالم میں کہے جا رہا تھا

”شروع شروع میں میری لندن جا کر کرسٹینا سے ایک دو جھڑپیں ہوئیں ... میں وہاں جاتا تو اُسے دیکھتا یہاں آتا تو تمہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے اس قدر Diverse ہو کہ میں نے انجانے میں تم دونوں کا کمپیئر کرنا شروع کر دیا۔“ گہرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اچانک اس پر گہری نظریں ٹکائیں تو اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کے لیے منتشر ہوئی۔

” ہر بار تم ہی حاوی ہو جاتیں کرسٹینا کے مقابلے میں ہمیشہ Subdued رہتیں اور دھیرے دھیرے کرسٹینا پسمنظر کا حصہ بننے لگی۔“ لمحے بھر کے لیے رک اس نے گہری سانس بھری۔

” شروع میں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو سکا ... میں تمہیں انور اور ہرٹ کرنے لگا، مگر جلد ہی تم نے مجھے مجھ سے چھین لیا ایما شاذان! ... ہاں آج میں Confess (اعتراف) کرتا ہوں کہ تم نے مجھے کرسٹینا سے چھین کر اپنا بنا لیا ہے ایما۔ اعیان کی شکل میں تم نے مجھے ایک ایسی زنجیر سے باندھ ڈالا ہے کہ اگر ہم دونوں بھی چاہیں تو اس ریلیشن کو توڑ نہیں سکتے۔“ گہرے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی ایما کو بے اختیار خود سے لگا لیا تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگی۔ اب تک حیرت سے نظریں اس کے چہرے پر سچ تلاش رہی تھیں۔ ”اگر بلیو نہیں ہوتا تو یہ دیکھو۔“

سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایک فائل اس نے اٹھا کر ایما کی طرف بڑھائی۔ ”میں نے کرسٹینا کو ڈائیورس کر دیا ہے اور یہ چھ مہینے اسی سلسلے میں لندن میں گزارنے پڑے کہ کرسٹینا نے مجھ پر کیس کر دیا تھا۔ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔“ اس نے بتایا تو ایما ان انکشاف کی آندھی میں ہچکولے کھانے لگی۔ فائل تو کیا تھمتی تھک کر اس کے کندھے سے سرٹکا گئی۔

”باقی وقت بزنس وغیرہ وائنڈ اپ کرنے میں لگا ... اعیان اور تمہارے بغیر وقت کیسے گزارا ہے، بس میں ہی جانتا ہوں، مگر دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ یہاں واپس آؤں گا تو لندن سے مکمل تعلق توڑ کر ہی پاکستان کی زمین پر قدم دھروں گا۔ تو اب تمہارے سامنے ہوں ... کرلو فیصلہ۔“

جواباً وہ کیا کہتی، بے اختیار روتی چلی گئی، مگر یہ آنسو خوشی کے تھے۔ شاذان نے گہری سانس بھر کر تشکر سے اُسے دیکھا۔ ”چلو بس ... اب آنسو صاف کرلو ... دیکھو تم نے میری شرٹ کی کیا حالت بنا ڈالی ہے۔“

”اوہ ...“ وہ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ ”آپ تھکے ہوئے آئے ہیں ... چائے لے آؤں؟“ وہ پوچھتے ہوئے اٹھنے لگی تھی کہ شاذان نے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

”چائے نہیں، بس چاہ چاہیے تمہاری۔ اور یہ ٹرسٹ کہ تم نے میری خطائیں نظر انداز کر کے میرے جذبات کو اوپن ہارٹ قبول کر لیا ہے۔“

سب کچھ بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد شاذان نے سرشار انداز میں سوال کیا تو ایما نے شرما کر اس کے کندھے پر سرٹکا دیا۔ اب کہنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ شاذان نے اس اعتراف شکست پر ایک بھرپور تہقہہ لگایا جس نے اُسے بھی سرشار کر دیا۔ اور ایما کا دل شاذان سے کہہ رہا تھا۔

تمہیں پتا ہے کہ ہم ساحلوں کے پروردہ

محبوتوں میں بھی مضبوط جال باندھتے ہیں



پھر اس کے بعد کہیں بھی وہ جا نہیں سکتا  
جسے بھی باندھتے ہیں ہم کمال باندھتے ہیں













































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































































